مجلہ علمی و تحقیقاتی

اختر تابان

جمادی الاول و جمادی الثانی ۱۴۴۷ھ

بنیاد اختر تابان

www.allamahrizvi.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معرفی بنیاد اختر تابان

رئیس المبلغین علامہ سید سعید اختر رضویؒ کے علمی آثار اور آپ کے تبلیغی خدمات اور طریقۂ کار کو علمی اور مذہبی حلقوں تک پہنچانے کے لئے سرزمین مقدسہ قم –ایران پر "بنیاد اختر تابان" نامی ادارہ، علامہ رضویؒ کے پوتے جناب حجۃ الاسلام سید کاظم رضوی (حفظہ اللہ تعالیٰ) کے زیر نگرانی دینی و علمی خدمات انجام دے رہا ہے۔

مذکورہ ادارہ مختلف علماء کے تعاون سے عربی، فارسی، اردو، انگریزی، گجراتی، ہندی، سواحلی زبانوں میں متعدد علمی، تحقیقی اور تبلیغی امور انجام دے رہا ہے اور ایران، مشرقی آفریقا و ہندوستان کے مختلف مذہبی، سماجی اداروں اور تنظیموں سے بھی مرتبط ہے۔

بنیاد اختر تابان کی اہم خدمات

- آثار و مکتوبات علامہ رضویؒ کی جدید نشر و اشاعت۔
- مشرقی آفریقا میں اسلامی مدارس کے لئے تعلیمی نصاب کی تدوین۔
- مبلغین کے لئے تعلیمی و تحقیقی کورسز کا انعقاد۔
- سوشل میڈیا گروپس اور چینلز کے ذریعہ دینی، مذہبی اور علمی پیغامات کی تبلیغ و ترویج۔
- برصغیر، مشرقی افریقا اور جنوبی ایشیا کے لئے علمی، تحقیقی امور کو انجام دینا۔
- ویب سائٹ «WWW.ALLAMAHRIZVI.COM» کی تشکیل۔
- علامہ رضویؒ کی سوانح حیات کی ڈاکیومینٹری تیار کرنا۔
- علمی و فکری جلسات کا انعقاد۔
- دوماہی علمی اور تحقیقی مجلّہ «اختر تابان» کی اشاعت۔

حجۃ الاسلام والمسلمین سید کاظم رضوی
(بانی و مدیر بنیاد اختر تابان)

رئیس المبلغین علامہ
سید سعید اختر رضوی مرحوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی حضرت ولیعصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف

دوماہی مجلہ علمی و تحقیقاتی اختر تابان

سال ۲ | شمارہ ۳ | جمادی الاول و جمادی الثانی ۱۴۴۷ھ

مشخصات مجلّہ

ناظر اعلیٰ
حجۃ الاسلام والمسلمین سید کاظم رضوی

مدیر اجرائی
مولانا سید تعلیم رضا جعفری

معاون اجرائی
ڈاکٹر سید باقر ایلیار رضوی

گرافیک و ڈیزائن
سید روح اللہ نقوی

بنیاد اختر تابان

خیابان صفائیہ، کوچہ ۲۸، چہار راہ اول، پلاک ۶۳

+۹۸۹۹۶۳۷۷۸۶۱۴ - ۰۲۵۳۷۸۳۷۵۰۶

www.AllamahRizvi.com

info@allamahrizvi.com

اہل قلم حضرات سے مفید مقالات ارسال فرمانے کی گزارش ہے۔
البتہ مقالہ نگار کی آراء سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔

فہرست مطالب

- چراغ ہدایت — ۴
  اداریہ
- طہارت کی مکمل تجلی — ۵
  آیت کا پیغام
- سچا دوست — ۷
  بیان حدیث
- اسلام کا خانوادگی نظام — ۸

  رئیس المبلغین علامہ سید سعید اختر رضوی گوپالپوری (اعلی اللہ مقامہ)
- شخصیت و سیرت فاطمیؑ کے تین بنیادی پہلو — ۳۹

  مولانا سید تعلیم رضا جعفری
- تسبیح حضرت فاطمہ زہرا (علیہا السلام) — ۵۱

  مولانا سید معظم حسین زیدی
- حضرت فاطمہ زہراؑ؛ عالمین کے لئے اسوہ کاملہ — ۶۹

  مولانا کاشف رضا گلزار
- امام زین العابدینؑ کا بہترین طرز زندگی — ۷۴

  مولانا محمد علی
- مقامات حضرت فاطمہ زہراؑ آیات کی روشنی میں — ۸۵

  مولانا سید کاشف محمد رضوی
- حضرت فاطمہ کلابیہ؛ ام البنین علیہا السلام — ۹۶

  سیدہ نہاں نقوی
- نوحہ غربت زہراؑ — ۱۰۰

  مولانا جعفر نقی صابری
- مدح شہزادی عالمؑ و ثانی زہراؑ — ۱۰۱

  مولانا سید معظم حسین زیدی
- THE PROPHET'S (PBUH) CAMPAIGN AGAINST THE JEWS OF MEDINA- (2) — ۱۰۴
  RAIS AL-MUBALLIGHEEN ALLAMAH SAYYID SAEED AKHTAR RIZVI

توجہ: مقالہ نگار کی آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔
علماء کرام اور طلاب محترم اپنے مفید مقالات اور تحقیقی آراء سے ہمیں نواز کر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں۔

بنیاد اختر تابان۔ قم

اداریہ: چراغ ہدایت

ماہِ جمادی الاول اور جمادی الثانی، ہمارے لیے صرف تقویمی ایام کی تبدیلی نہیں، بلکہ ایک عظیم تاریخی واقعہ کی یاد دہانی ہے۔ یہ وہ مہینے ہیں جن میں اہلِ بیت (علیہم السلام) سے منسوب متعدد تاریخیں ہیں۔ جن میں سے شمعِ ہدایت، حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا)، کی شہادت کے دن بھی ہیں۔ دنیائے تشیع انہیں دو مہینوں میں شہادت حضرت فاطمہ زہراؑ کا غم مناتی ہے۔ شہادت کی واقعی تاریخ میں اختلاف ہے لیکن یہ اختلافِ تاریخ، ہمیں آپ کی عظمت، قربانی اور پیغام سے دور نہیں کرتی؛ بلکہ ہمیں یہ موقع دیتی ہے کہ تمام مناسبتوں میں آپ کی زندگی، جدوجہد، صبر اور ولایت کے درس کو اپنے دلوں میں اتاریں اور چراغ ہدایت کو اپنے عمل و کردار سے روشن کرکے دوسروں کے قلوب کو بھی منور کریں اور سیرت فاطمیؑ کو اپناتے ہوئے اس کی تبلیغ کریں۔

حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) صرف "نبی کی بیٹی" یا "امیر المؤمنینؑ کی زوجہ" یا "حسنینؑ کی ماں" نہیں تھیں؛ بلکہ آپ ایک مکمل انسان تھیں جن میں معنویت کی بلند ترین اونچائی، خاندانی ذمہ داری کا مکمل نظام و نصاب، اور سیاسی جدوجہد کی جرات کا امتزاج تھا۔ آپؑ نے نہ صرف مسجد میں خطبۂ فدکیہ دے کر حق کا دفاع کیا، بلکہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر بھوکوں اور ضرورتمندوں کے لئے رزق کا انتظام کیا، بیماروں کی تیمارداری فرمائی اور اپنے شوہر کو راہ خدا میں خدمات اور قربانیوں کے لئے مدد فرمائی۔ آپ کی زندگی ہمیں سکھاتی ہے کہ عبادت اور جہاد، خانہ داری اور سیاست، کوشش اور خدمات۔ یہ سب ایک کامل مسلمان کی شخصیت کے اجزاء ہیں، یہ الگ الگ لوگوں کے لئے الگ الگ راستے نہیں ہیں۔

قارئین کے ہاتھوں میں جو خصوصی مجلّہ ہے، اس میں زیادہ تر مضامین حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کی عظیم شخصیت اور آپ کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ آپؑ کی زندگی کے متعدد پہلوؤں کو آئیڈیل بناکر اپنی زندگی میں بہترین تبدیلی لائیں اور خاص طور پر اپنی قوم کی بیٹیوں کو علم و معنویت و اسلامی اخلاق کے زیور سے آراستہ کریں اور مختلف "سماجی میدانوں" میں شراکت کے لئے آمادہ کریں کیونکہ ہمارے سامنے حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) ایک ایسا نمونہ ہیں کہ جو ایک ہی وقت میں بیٹی، بیوی، ماں کے ساتھ ساتھ عابدہ، مجاہدہ، خطیبہ اور قوم کے لئے معلّمہ و مربی و رہنما رہی ہیں۔ اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ "فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) صرف ایک تاریخی شخصیت نہیں، بلکہ ہر دور کے لیے چراغ ہدایت ہیں۔" خداوند متعال سے دعا ہے کہ ہمیں آپؑ کی پاکیزہ سیرت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین یاربّ العالمین)۔

آیت کا پیغام؛ طہارت کی مکمل تجلی

"إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا"؛ (سورہ احزاب، آیت ۳۳)۔ یعنی بس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہل بیتؑ کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

آیتِ تطہیر قرآن مجید کی وہ عظیم الشان آیت ہے جو صرف ایک اخلاقی یا روحانی تعلیم نہیں دیتی، بلکہ اسلامی عقیدے کی ایک بنیاد یعنی عصمتِ اہلِ بیت (علیہم السلام)—کی قرآنی دلیل ہے۔ اور اس آیت کے نزول کے مطابق مخاطبین میں سے ایک مرکزی ہستی، حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کو حاصل ہیں۔ آپ گویا قرآن کی نگاہ میں "طہارت کی مکمل تجلی" ہیں۔ چنانچہ آیت کے نزول کے حوالے سے نقل ہوا ہے کہ جب اہل بیتؑ اطہار، چادر میں جمع ہوئے تو رسول خداؐ نے دعا فرمائی: «اللّٰهُمَّ هٰؤُلاءِ أَهْلُ بَيْتِي، فَاذْهَبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيرًا» "یااللہ! یہ میرے اہلِ بیتؑ ہیں، انہیں ہر طرح کی برائی و ناپاکی سے دور رکھنا اور ایسے پاک و پاکیزہ رکھنا جو حق ہے۔ اور اسی چادر کے واقعہ میں خداوند متعال نے حضرت فاطمہ زہراؑ ہی کو مرکزی حیثیت بنا کر جبرئیلؑ کے سوال کے جواب میں پنجتن پاکؑ کو اس طرح پہنچوایا تھا کہ: «وهم فاطمة و أبوها و بعلها و بنوها»؛ اے جبرئیلؑ، چادر کے اندر فاطمہؑ ہیں، ان کے بابا ہیں، ان کے شوہر ہیں اور ان کے بیٹے ہیں (عوالم العلوم، بحرانی، ج۱۱ ص۹۳۰۔ غرر الاخبار، ج۱، ص۲۹۸)۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت فاطمہ زہراؑ کو طہارت کا مرکز کیوں بنایا گیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ آیتِ تطہیر صرف ظاہری پاکیزگی کی بات نہیں کرتی، بلکہ باطنی، روحانی، عقیدتی اور اخلاقی ہر قسم کی ناپاکی اور نواقص سے مکمل پاک ہونے کی بات بیان کرتی ہے—یعنی مقام "عصمت" کو بیان کرتی ہے۔ اور عصمت وہ مقام ہے جہاں انسان گناہ سے بالکل محفوظ ہوتا ہے، نہ صرف عمل میں، بلکہ خیال، نیت اور ارادے میں بھی۔ اور حضرت فاطمہ زہراؑ کی زندگی اس عصمت کی زندہ مثال ہے کیونکہ آپؑ بچپن سے آخر عمر تک عبادت، ذکر اور ریاضت میں مصروف رہیں۔ ایسی عبادت کہ آپ کے قدموں میں ورم آ جاتا تھا۔ آپ غربت کے باوجود دوسروں کی ضروریات زندگی کے لئے مرکز اور پناہ گاہ تھیں، دوسروں کو کھانا دے دیتی تھیں اور خود بھوکی سو جاتی تھیں۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد جب آپ کا حق چھینا گیا، تو آپ تن تنہا کھڑی ہوئیں، امامت و ولایت الٰہیہ امیر المومنینؑ کا دفاع کیا اور آخری سانس تک کسی بھی مشکل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ آپ کی زندگی میں نہ کوئی جھوٹ تھا، نہ

حرص، نہ حسد، نہ دنیا کی محبت ـــ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ اور امام وقت کی محبت تھی۔ یہی وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے آپ "سیدۃ نساء العالمین" ـــ یعنی تمام جہان کی خواتین کی سردار ـــ قرار پائیں اور ایک مکمل اسوہ حسنہ بنیں جہاں ظاہری اور باطنی لحاظ سے کسی طرح کا نقص و عیب نہیں تھا۔ اور خداوند متعال نے اسی پاکیزہ زندگی اور تجلی طہارت کی وجہ سے آپ کی آغوش کو معصوم اماموں سے بھر دیا اور آپ نو معصوم ہستیوں کی ماں قرار پائیں۔

دور حاضر میں جہاں خواتین کو یا تو "گھر کی چار دیواری" میں قید کر دیئے جانے کی فکر ہے یا پھر "مکمل آزادی" کے نام پر ان کی عزت اور وقار کو پامال کیا جاتا ہے، حضرت فاطمہ زہراؑ بہترین اور اعلیٰ نمونہ حیات کی حامل معتدل زندگی ایک مسلم خاتون کے لئے بے مثال نمونہ ہے جہاں آپ ایک ہی وقت میں عابدہ، خطیبہ، مجاہدہ، صابرہ، طاہرہ، اور مکمل معنی میں بہترین رہنما تھیں، وہی منفرد اور بے مثال ماں، بیٹی و بیوی تھیں ـــ اور عملی طور پر "وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا" کی مکمل تصویر تھیں جن کا دامن کردار کامل، جامع اور دائمی نمونہ عمل ہے۔

پروردگار عالم سے دعا ہے کہ ہمیں حضرت فاطمہ زہراؑ کے اس پاکیزہ سایۂ ولایت میں جگہ دے اور ہمیں آپ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بیان حدیث؛ سچا دوست

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: "مَنْ كانَ الْوَرَعُ سَجِيَّتَهُ، وَ الْكَرَمُ طَبيعَتَهُ، وَ الْحِلْمُ خَلَّتَهُ كَثُرَ صَديقُهُ"؛ پرہیز گاری جس کی فطرت ہو، کرم جس کی طبیعت ہو اور حلم و بردباری جس کا لباس ہو، اس شخص کے دوست بہت زیادہ رہیں گے (بحار الانوار، ج۶۶، ص۴۰۷)۔

ورع یعنی پرہیز گاری اگر انسان کی فطرت و عادت ہو جائے اور وہ گناہوں سے بچنے والا، پاکدامن اور دین و دنیا کی ہر برائی سے پرہیز کرنے والا ہو تو اس کے لئے نیک راستے پر قائم رہنا آسان ہو جاتا ہے اور وہ معاشرتی اعتبار سے باوقار اور لوگوں کا محبوب بن جاتا ہے۔

کرم و سخاوت جب انسان کی طبیعت بن جاتی ہے تو انسان ہمیشہ دوسروں پر دستِ کرم اور عطا کرنے والا ہو جاتا ہے اور دل کھول کر لوگوں کی مدد کرنے والا اور اپنے مال و وقت و صلاحیت و علم و ہنر کے ذریعہ بخشش و مدد کرنے میں بخل نہیں کرتا ہے اور اس طرح اس کے لئے دوسروں کے دل جیتنا آسان ہو جاتا ہے۔

حلم یعنی بردباری، صبر و تحمل۔ جب انسان ان چیزوں کا لباس پہن لیتا ہے تو اس کی شخصیت کا دائمی رنگ ہی اپنے غصہ و بغض کو قابو کر کے نرم مزاجی اختیار کرنا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ اپنے مخالفین کو بھی اپنی طرف جذب کر لیتا ہے۔

جب کوئی انسان ان تین صفات کا حامل ہو ــــ یعنی پرہیز گاری اس کا پیشہ ہو، سخاوت اس کی فطرت ہو، اور صبر و برداشت اس کا لباس ہو ــــ تو اس کی دوستیاں بہت بڑھ جاتی ہیں کیونکہ لوگ اس کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں، اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کے ساتھ گھلنے ملنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ اخلاقی تعلیم بھی ملتی ہے کہ نیک دوست بنانے اور زیادہ دن والی دوستی کے لیے خود کو سنوارنا، اور اچھے اخلاق کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ یہ صفات انسان کو معاشرے میں عزت و محبت دلاتی ہیں کیونکہ ایسا ہی شخص واقعی معنوں میں ایک سچا دوست ثابت ہوتا ہے اور دوسروں کے لئے مفید ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دوستوں اور چاہنے والوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔

اسلام کا خانوادگی نظام

(بخش اول)

▪ مرحوم رئیس المبلغین علامہ سید سعید اختر رضوی گوپالپوری صاحب۔

نوٹ: مندرجہ ذیل تحریر مرحوم رئیس المبلغین علامہ سید سعید اختر رضوی گوپالپوری (نوراللہ مرقدہ) کی کتاب "اسلام کا خانوادگی نظام" سے اقتباس ہے جو آپ کے آثار سے متعلق ویب سائٹ (www.allamahrizvi.com) پر موجود ہے۔ البتہ بعض موارد پر مزید حوالوں اور مناسب مطالب کا اضافہ کیا گیا ہے (ادارہ)۔

پہلا باب: نظام خانوادگی اور اسلامی نقطہ نظر

ا۔ نظام خانوادگی کی اہمیت

ایک سنجیدہ اور متوازن خاندانی نظام خوش گوار زندگی کی بنیاد بلکہ ترقی پذیر معاشرے کی اساس ہے۔ مذہب انسان کو بارگاہ الٰہی سے قریب تر کرنے کے لئے آتا ہے۔اور یہ مقصد ہر گز حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ایک ایسا ماحول پیدا نہ ہو جائے جو دینی مطالبات سے ہم آہنگ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی دین اس وقت تک مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک اس کے تعلیمات واضح طریقے سے یہ نہ بتائیں کہ خاندان میں ہر فرد کی کیا ذمہ داری ہے؟ کیا درجہ ہے؟۔خاندان انسانی معاشرہ کی ایک ایسی اکائی ہے جس کے افراد ایک دوسرے سے انتہائی قریبی رابطہ رکھتے ہیں اور اس قربت ہی سے کشاکش اور اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک اپنے فرائض و حقوق کی غیر مبہم (روشن) تصویر ہر ایک کے پیش نظر نہ ہو کشمکش کا پیدا ہونا یقینی ہے۔

اگر کوئی دین نظام خانوادگی کی پیچیدگیوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے تو جلد یا دیر سے اس کے ماننے والے اس دین سے بغاوت کر بیٹھتے ہیں اور سرکشی کا سیلاب مذہبی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ اس کا سبب ظاہر ہے جو ماحول ان کو نصیب ہوتا ہے، جس سماجی نظام میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں وہ اس دین کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اور گردو پیش کے غیر شعوری اثرات سے متاثر ہوتے ہوتے وہ مذہب سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آخرکار ایک وقت ایسا آتا ہے جب دین و مذہب

چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے، جس کا عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں رہتا۔

عیسائیت کا حشر ہمارے پیش نظر ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے صدیوں بعد اس دین کے پیشواؤں نے فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تجرد کی زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کی حیثیت سے پیش کیا۔ بہت سے مخلص اور پرجوش عیسائیوں نے اس آئیڈیل کو اپنا لیا۔ راہبوں اور راہباؤں نے اپنے کو دیر اور صومعہ میں بند کر لیا۔ ایک عرصہ تک یہ سسٹم کامیابی سے چلتا رہا۔ اور اس کے بعد فطرت نے اپنا انتقام شروع کر دیا۔ راہبوں اور ان کے سرداروں نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ وہ عیسیٰ مسیحؑ کے نمایندے ہیں اور راہبائیں عیسیٰ مسیحؑ کی دلہنیں ہیں۔ اس عقیدہ کے راسخ ہوتے ہی صومعہ اور خانقاہیں جنسی آزادی کا مرکز بن گئیں۔

فطرت ایک فولادی اسپرنگ ہے اس کو جتنا دباؤ گے وہ اتنی ہی طاقت سے اوپر اچھلے گی۔ یہ فطرت کا عیسائیوں سے انتقام ہے جس نے آج عیسائی معاشرے کو اتنا بے لگام اور آزاد بنا دیا ہے کہ دنیا نے کبھی اس کی نظیر نہیں دیکھی تھی۔

اگر دین، فطرت سے ہم آہنگ نہ ہو تو اس کا یہی حشر ہوتا ہے اور ایسے ہی نتائج سامنے آتے ہیں جب مذہبی لیڈران یہ سمجھتے ہیں کہ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ''اپنے ہمسایہ سے محبت کرو'' بغیر یہ بتائے ہوئے کہ کیونکر، بغیر اس کے کہ اس کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

۲۔ اسلام اور نظام خانوادگی

اسلام آخری دین ہے اور اس کی شریعت بہترین مثالی شریعت ہے۔ ایک غیر جانبدارانہ تبصرہ کرنے والا اس توازن کو دیکھ کر حیران رہ جائے گا جو اسلامی تعلیمات نے بنیادی تقاضوں اور روحانی ضروریات کے درمیان پیدا کیا ہے۔ اسلام نے اس حیات دنیوی کے لئے بھی ہدایات دی ہیں اور اخروی اور ابدی زندگی کے لئے بھی لائحہ عمل مرتب کر کے دیا ہے۔

یہی وہ شمع ہدایت ہیں جو شاہراہ حیات کے ہر موڑ پر انسان کی چشم بصیرت کو ضیاء بخشتی ہے۔ یہی وہ مکمل شریعت ہے جس نے نوع انسانی کی کسی احتیاج کو تشنہ توجہ نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گھریلو زندگی۔ جی چاہے اسے تدبیر منزل کہو یا نظام خانوادگی۔ کے بھی ہر عقدہ کو اس الٰہی شریعت نے اس خوبصورتی سے حل کر دیا ہے کہ اس سے بہتر تصویر تجویز کرنی احاطہ امکان سے باہر ہے: **لیس فی الامکان احسن مما کان**۔

مجھے عیسائی مصنفین کے رویہ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ اسلامی شریعت سے اپنے دین کا موازنہ کرتے ہیں تو ایک

احساس کمتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں کیونکہ عیسائیت قوانین و احکام کے لحاظ سے بالکل مفلس ہے جب کہ اسلام ہر نقص سے مبرا اور تمام کمالات کا جامع ہے۔ اس لئے یہ مصنفین اسلام کے حاوی قوانین ہونے کو ایک ''عیب'' بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یا بہ صورت دیگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت اسلام کے تعلیمات عیسائیت کے اخلاقی میعار کے مقابلے میں بہت پست ہیں۔ (اس دعوے پر آئندہ تبصرہ کیا جائے گا)۔

۳۔ نظام خانوادگی کے ارکان

کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے بغیر خاندان یا خانوادہ مکمل نہیں ہوتا۔ انسان کی پیدائش کے لئے باپ اور ماں کا وجود لازمی ہے۔ طفلی میں والدین اس کی پرورش و تربیت کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ بچہ جوان ہوتا ہے اس کے بعد ازدواج کی سنہری زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔ پھر نخل تمنا میں اولاد کی صورت میں ثمر آرزو لگتے ہیں۔ گویا وہ افراد جنہیں ایوان تدبیر منزل کا ستون کہنا چاہئے وہ ہیں: باپ، ماں، اولاد، شوہر اور زوجہ۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگ چند معاونین کے بغیر نہیں رہ سکتے اس لئے اسلام نے اس فہرست میں ''خادم'' کا بھی اضافہ کیا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالی پر بھروسہ کرتے ہوئے آئندہ صفحات میں متذکرہ بالا افراد کے باہمی تعلقات اور ان کے حقوق و فرائض پر اسلام کے ہادیان برحق کے ارشادات کی روشنی میں تبصرہ کرنا مقصود ہے تاکہ برادران ایمانی ان کی مدد سے اپنی گھریلو زندگی کو بہشت زار بنا سکیں۔ اللہ ہمیں اپنی سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے کہ اسی میں دنیا و آخرت کی بہبودی کا راز مضمر ہے۔

''رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ'' (سورہ بقرہ، آیت ۲۰۱)۔

۴۔ مشترکہ خاندان اور جداگانہ خاندان

متمدن دنیا میں دو قسم کے نظام خانوادگی عام طور پر رائج ہیں: مشترکہ خاندان کا نظام اور جداگانہ خاندان کا نظام۔

الف: مشترکہ خاندان کا نظام

یہ اصول یہ سکھاتا ہے کہ ایک خاندان کے تمام افراد باپ، بیٹا، بھائی، بہن، چچا، بھتیجے وغیرہ ایک ساتھ رہیں۔ کمانے والوں کی کمائی ان کی انفرادی ملکیت نہیں سمجھی جاتی بلکہ پورے خاندان کی ملکیت ہوتی ہے اور گھر کا بزرگ تمام خاندان کے اخراجات اسی ''خاندانی آمدنی'' سے پورا کرتا ہے۔

ب: جداگانہ خاندان کا نظام

یہ اصول یہ بتاتا ہے کہ ہر شخص اپنے عیال کا بوجھ خود اپنے سر پر اٹھائے۔ اسی بنا پر اس کی آمدنی اس

کی انفرادی ملکیت ہوتی ہے "خاندانی آمدنی" نہیں سمجھی جاتی۔

ہندوؤں میں قدیم الایام سے پہلا اصول رائج تھا اور عربوں میں دوسرا۔ شاید اسی کا اثر رہا ہو کہ ہندوستان میں چچا، پھوپھی، خالہ اور ماموں کی لڑکی کو بھی "بہن" کہا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف عرب میں وہ محض بنت عم، بنت عمہ، بنت خالہ اور بنت خال (چچا، چچی، پھوپھی اور خالو کی بیٹی) ہے اور بس۔

ہندوؤں کے نزدیک ان رشتہ داروں کو "محرمات" (محرم خواتین) کی فہرست میں داخل کرنے کی بھی شاید یہی وجہ رہی ہو۔ مثلاً ان میں لڑکا اپنے چچا کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ "بہن" ہے۔ جب کہ عربوں کا رویہ ایسا نہ تھا اور اسلام نے ان کی تائید بھی کی۔

بہر حال، یہ دونوں اصول بہت پرانے ہیں اور ہر ایک میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔

۴۔ مشترکہ خاندان کے فوائد اور خرابیاں

مشترکہ خاندان کا اصول انسانی ہمدردی، اخلاقی عروج اور باہمی اعتماد و تعاون کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ خاندان کے افراد ایک ہی اصل کی فرع ہیں۔ فطرت کا اشارہ یہ ہے کہ انہیں خانہ داری کے انتظامات اور گھریلو زندگی میں بھی وحدت کا مظہر ہونا چاہئے۔ یہ یکجہتی قلبی اطمینان اور روحانی سکون کی ضامن ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اس نظام کی وجہ سے خاندان کے ان افراد کی زندگی مصائب و آلام کا شکار نہیں بننے پاتی جو کسی وجہ سے کسب معاش سے معذور ہوں۔ اس طرح انہیں بے آبروئی اور فکر و تردد کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ گویا یہ نظام خانوادگی ایک بیمہ کمپنی کی طرح بڑھاپے، بیکاری یا بیماری کی صورت میں انسان کی تمام مالی ذمہ داریوں کو اپنے کندھے پر لے لیتا ہے اور گھر والوں کا دماغ فکر فردا کی کشمکش سے محفوظ رہتا ہے۔

یہ تو اس نظام کے مثبت اثرات تھے۔ لیکن یہی فوائد اس کے نقصانات اور منفی اثرات کو جنم دیتے ہیں۔ وہی اطمینان قلب جو اس نظام میں پیدا ہوتا ہے اکثر اوقات گھریلو زندگی کے لیے زہر بن جاتا ہے۔ خود غرض اور بے اصول افراد دوسروں کی محنت کا ناجائز فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے۔ خاندان کا ایک کاہل فرد خود بھی محنت کرنے کے بجائے دوسرے افراد کی کمائی سے آرام اٹھاتا رہتا ہے۔ اسے کسب معاش کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہوتا ہے جب ایک مرتبہ بے کاری کا چسکا لگ جائے تو پھر کام نہ کرنے کے لئے بہت سے بہانے پیدا کر لئے جاتے ہیں۔ آخر اسے کیا پڑی ہے کہ محنت و مشقت کی چکی میں پستا رہے جبکہ دوسرے لوگ اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر

اٹھانے کے لئے موجود اور آمادہ ہیں؟ دراصل جب تک اسے اس کا احساس نہ ہو گا کہ وہ اس طرح دوسروں کا استحصال نہیں کر سکتا۔اس وقت تک وہ اپنی روزی خود کمانے کی سنجیدہ کوشش نہیں کر سکتا۔ نہ تو اس کے دل میں کسب معاش کا حقیقی جذبہ بیدار ہو گا اور نہ ہی اس کی خوابیدہ رگ غیرت میں خون صالح دوڑے گا۔

اسی طرح یہ نظام جدوجہد کے حوصلے کو پامال کرتا ہے۔ اگر ایک شخص روزی حاصل کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی آمدنی کا معیار اونچا ہو جاتا ہے تو اس کا معیار زندگی فطری طور سے دوسرے ایسے شخص کے مقابلے میں بلند ہو گا جس کی آمدنی اس کے مقابلے میں کم ہے۔ جدوجہد کی زیادتی معیار زندگی کی بلندی کی متقاضی ہے۔ اگر ایک بھائی کی آمدنی دوسرے بھائی کی آمدنی سے دوگنی ہے تو عقلاً دونوں کے معیار زندگی میں تفاوت ہونا چاہئے۔ لیکن مشترکہ خاندان میں ایسا نہیں ہو پاتا جس کی وجہ سے سعی و کوشش کا جذبہ اور زیادہ کمانے کا ولولہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اس کی وجہ سے خاندان میں ہم آہنگی، محبت اور اعتماد کی فضا پیدا ہو (جیسا کہ اس کے فوائد کو پڑھ کر توقع کی جاتی ہے) یہ گھریلو جھگڑوں اور اختلافات کا بنیادی سبب بن جاتا ہے۔ اگر ایک بھائی مشترکہ خاندان کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے جان توڑ محنت کرتا رہتا ہے جبکہ اس کا بھائی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے، یا جب وہ آمدنی بڑھانے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کرتا ہے تو اس کا بھائی اپنی ترقی کے مواقع کو ہاتھ سے گنواتا رہتا ہے۔ اس وقت خاندان میں جو زشت ترین صورت میں نمودار ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے۔ خاندان والوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے غصہ اور نفرت کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں کا بدترین ردعمل سامنے آتا ہے۔ بدگمانی کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ باہمی اعتماد، محبت اور شادمانی کی جگہ تلخیاں اور نفرتیں ابھر آتی ہیں۔ دھیرے دھیرے گھر کی سکون آفرین فضا دنیوی جہنم بن جاتی ہے۔ اور یہ پھوڑا بڑھ کر ایسا ناسور بن جاتا ہے کہ افتراق اور جدائی کا نشتر لگائے بغیر اس کا اندمال (علاج) ناممکن ہو جاتا ہے۔

۵۔ جداگانہ خاندان کے فوائد اور خرابیاں

جداگانہ خاندان میں ایک طرف وہ خرابیاں نہیں ہیں جو مشترکہ خاندان کے نظام میں پائی جاتی ہیں تو دوسری طرف یہ اس کی خوبیوں سے محروم بھی ہے۔ اپنے دوسرے رشتہ داروں سے بالکل بے تعلق ہو کر رہ جانا یقیناً انسانیت کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ اس کی وجہ

سے انسان خود غرضی اور تنگ دلی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ گہری نظر رکھنے والے تو تمام بنی آدم کو پیکر انسانیت کے اعزاز سمجھتے ہیں:

ع: بنی آدم اعضاء یک دیگر اند

مگر یہ نظام خانوادگی ایک ہی ماں کا دودھ پینے والوں کو ایک دوسرے سے بے پرواہ بنا دیتا ہے۔

۶۔ اسلامی معاشرت کا حکیمانہ اصول

آیئے اب اسلام کے حکیمانہ اصول پر نظر ڈالیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے ان دونوں طریقوں کے درمیان ایک ایسی سیدھی شاہراہ بنائی ہے کہ اس پر گامزن ہونے کے بعد انسان دونوں نظاموں کی عطر آگیں خوشبو سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور اس کے باوجود ان کے کانٹوں سے اس کا دامن محفوظ رہتا ہے۔اس نے ذوق بیکاری کے خون فاسد کو رگ تخیل سے باہر نکال دیا یہ کہہ کر کہ ہر شخص اپنے بیوی بچوں کے مصارف کا خود ذمہ دار ہے۔اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے عیال کا بار دوسروں کے کندھوں پر ڈال دے۔اس طرح مشترکہ خاندان کے مضر اثرات کا قلع قمع کر دیا گیا۔لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر شخص کو صلۂ رحم کی انتہائی تاکید کی گئی۔رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کو واجب کر دیا گیا تاکہ خود غرضی یا اقارب سے بے تعلّقی کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔ اس طرح جداگانہ خاندان کی خرابیوں سے معاشرے کو بچالیا گیا۔

۷۔ واجب النفقہ افراد

اصولاً ان افراد کی تعداد محدود کر دی گئی جن کے اخراجات برداشت کرنا بہر حال لازم ہے۔

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

”أَمَّا الْوُجُوهُ الَّتِي فِيهَا إِخْرَاجُ الْأَمْوَالِ فِي جَمِيعِ وُجُوهِ الْحَلَالِ الْمُفْتَرَضُ عَلَيْهِمْ وَ وُجُوهُ النَّوَافِلِ كُلِّهَا فَأَرْبَعَةٌ وَ عِشْرُونَ وَجْهاً . . . وَ أَمَّا الْوُجُوهُ الْخَمْسُ الَّتِي تَجِبُ عَلَيْهِ النَّفَقَةُ لِمَنْ تَلْزَمُهُ نَفْسُهُ فَعَلَى وَلَدِهِ وَ وَالِدَيْهِ وَ امْرَأَتِهِ وَ مَمْلُوكِهِ لَازِمٌ لَهُ ذَلِكَ فِي حَالِ الْعُسْرِ وَ الْيُسْرِ۔

”اپنا مال صرف کرنے کی جائز صورتیں ۲۴ ہیں ... پس وہ پانچ صورتیں جن میں مال صرف کرنا واجب ہے پس (وہ یہ ہیں): اپنی اولاد پر اور باپ، ماں پر اور اپنی زوجہ پر اور اپنے غلام (خادم) پر کہ ان کا نفقہ عسرت (تنگی) اور توانگری ہر حال میں لازم ہے“ (تحف العقول، ص۳۳۶-۳۳۷۔ وسائل الشیعۃ، ج۲۱ ، ص۵۱۵۔ بحار الانوار، ج۱۰۰، ص۴۴)۔

لیکن اگر انسان فارغ البال اور خوشحال ہو تو پھر تمام رشتہ داروں سے حسن سلوک لازم کر دیا گیا۔ مذکورہ بالا حدیث آگے چل کر ہمیں بتاتی ہے کہ:

"وَ أَمَّا الْوُجُوهُ الْخَمْسُ مِنْ وُجُوهِ الصِّلَاتِ النَّوَافِلِ فَصِلَةُ مَنْ فَوْقَهُ وَ صِلَةُ الْقَرَابَةِ وَ صِلَةُ الْمُؤْمِنِينَ وَ التَّنَفُّلُ فِي وُجُوهِ الصَّدَقَةِ وَ الْبِرِّ وَ الْعِتْقُ"

"اور پانچ مستحب اخراجات یہ ہیں: وقف شدہ صلہ، رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحم کرنا، مومنین سے حسن سلوک کرنا، مستحب صدقات ادا کرنا اور غلاموں کا آزاد کرنا" (مذکورہ منابع)۔

صلۂ رحم کے بارے میں بے شمار روایتیں انتہائی تاکید کے ساتھ وارد ہوئی ہیں جو حسب موقع (باب ۴) ذکر کی جائیں گی۔

یہاں پر ایک امر قابل ذکر ہے کہ باوجود یہ کہ ہندوؤں کا خاندانی دائرہ بہت وسیع تھا لیکن ان کے دل میں اپنے اعزہ کے لئے وہ شدید محبت نظر نہیں آتی جو جداگانہ معاشرت کے باوجود عربوں میں پائی جاتی تھی اور جس کی مناسب حد تک تائید اسلام نے بھی کی ہے۔

ایک انسان کے دل میں تحسین اور تعجب کے ملے جلے جذبات ابھر آتے ہیں جب وہ دیکھتا ہے کہ کس طرح اسلام نے مشترکہ خاندان کی مواسات اور جداگانہ خاندان کی اصول باقاعدگی کو ایک دوسرے میں سمو دیا ہے کہ بے اختیار دل پکار اٹھتا ہے کہ ع:

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

یعنی: بہت سی اچھی اور خوبصورت چیزوں کو دیکھا ہے لیکن تم ایک الگ ہی چیز ہو۔

ہر شخص یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ ایسا حسین اور مکمل نظام اسلام کے قبل کسی نے پیش نہیں کیا تھا۔

آخر کیا فائدہ ایسے مشترکہ نظام رہائش کا جس میں ایک ہندو باپ اپنے بیٹے کے ساتھ ایک برتن میں کھانے میں مذہب کو حائل پاتا ہے؟ اور کیا نقصان ہے جداگانہ خاندان کا جس میں ایک دوسرے کے گھر کھانا کھا لینے اور اس طرح رشتۂ محبت کو استوار تر بنانے کی ترغیب دی جاتی ہے؟

۸۔ حجاب کا لازمی نتیجہ

اسلامی معاشرے کی بنیاد میں یہ اصول شامل ہے کہ عورتیں نامحرم سے پردہ کریں۔ یہ اصول بھی جداگانہ خاندان کے نظام کی پرزور تائید کرتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے برادران وطن کے تمدن سے متاثر ہو کر مشترکہ خاندان کا اصول اختیار کر لیا ہے۔ (جس کی بنا پر) ہم دیکھتے ہیں کہ حجاب جیسا اہم اسلامی اصول ایک غیر اسلامی معاشرے پر قربان کر دیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں اسلامی تمدن کے کئی دوسرے اہم پہلو تہہ و بالا ہو کر رہ گئے ہیں، مندرجہ ذیل آیتِ قرآنی ہماری خاص توجہ کی طالب ہے:

"وَ قُلْ لِلْمُؤْمِنٰاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصٰارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَ لاٰ يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلاّٰ مٰا ظَهَرَ مِنْهٰا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلىٰ جُيُوبِهِنَّ وَ لاٰ يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلاّٰ لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبٰائِهِنَّ أَوْ آبٰاءِ

بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَ لَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ وَ تُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ"

"اور ایماندار عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اس کے جو (عادۃً) سے ظاہر ہو جاتی ہے اور اپنے دوپٹوں (کے آنچل) کو اپنے گریبان پر ڈالے رہیں اور اپنے شوہروں، یا اپنے باپ داداؤں، یا اپنے شوہر کے باپ داداؤں، یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہر کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں، یا اپنے قسم کی عورتوں یا اپنی لونڈیوں یا گھر کے وہ نوکر چاکر جو مرد صورت ہیں مگر بہت بوڑھے ہونے کی وجہ سے عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے۔ یا وہ کمسن لڑکے جو عورتوں کے پردے کی بات سے آگاہ نہیں ہیں، ان کے سوا کسی پر اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ ہونے دیا کریں" (سورہ نور، آیت ۳۱)۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس فہرست میں نہ تو شوہر کے بھائیوں کا ذکر ہے، نہ شوہر کے بھتیجوں یا بھانجوں کا تذکرہ ہے۔ ایک مسلمان عورت کو ان رشتہ داروں سے بھی اسی طرح اپنی زینت چھپانی اور حجاب کرنا ہے جس طرح دوسرے نامحرموں سے۔ لیکن مشترکہ خاندان کا اصول اس اہم قانون کی پیروی میں آڑے آتا ہے۔ اگر ایک مسلمان خاتون اپنے شوہر کے بھائی، بھتیجے یا بھانجے کے سامنے اپنی زینت کو ظاہر کردے تو وہ احکام اسلامی کی محفوظ چہار دیواری سے باہر نکل آئی اور ایک بار اس حد کو پار کرنے کے بعد نہیں کہا جاسکتا کہ یہ "نمائش زینت" کہاں جا کر رکے گی اور کہیں رکے گی بھی یا نہیں۔

قرآن مجید نے اس سورہ میں ایک دوسرے مقام پر اسے بالکل واضح کر دیا ہے کہ انسان اپنے عیال کا بار اپنے باپ ماں کے سر پر بھی ہمیشہ نہ ڈالے رہے۔ بلکہ اپنی کفالت خود کرے۔ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے چنانچہ حسب ذیل آیت میں ملاحظہ ہو:

"لَيْسَ عَلَى . . . حَرَجٌ . . . وَ لَا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ . . ."

"اور نہ خود تم لوگوں کے لئے کوئی مضائقہ ہے کہ (بغیر اجازت لئے ہوئے) اپنے گھروں میں کھانا کھاؤ یا اپنے باپ دادا نانا وغیرہ کے گھروں سے، یا اپنی

ماں دادی نانی وغیرہ کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اس گھر سے جس کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہیں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے ...“ (سورہ نور، آیت ۶۱)۔

اس آیت میں صریحی طور سے باپ، ماں، بھائی، بہن وغیرہم کے لئے علیحدہ علیحدہ بیوت (گھروں) کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سے کم از کم یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ”تمہارے گھروں“ اور تمہارے باپ یا تمہاری ماں کے گھروں میں فرق ہے۔ (اس کے ساتھ ساتھ وہ یکجہتی اور یگانگت بھی قابل تصور ہے جو اس آیت پر عمل کرنے سے پیدا ہوگی۔ ایک دوسرے کے گھروں میں کھانا محبت اور اتحاد پیدا کرنے کا سب سے یقینی ذریعہ ہے)۔

۹-ایک سوال

ہم جانتے ہیں کہ عربوں میں جداگانہ خاندان کا طریقہ رائج تھا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اپنا مقصد واضح کیا ہوگا؟

جواب

اسلام اس لئے نہیں آیا تھا کہ عربوں کے (یا کسی دوسرے کے) رسم ورواج کی پیروی کرے بلکہ وہ اس لئے آیا تھا کہ عربوں سمیت ساری دنیا کی رہنمائی کرے۔ پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے قبل عرب میں بہت سے اچھے اور برے رسوم رائج تھے۔ لیکن اسلام نے آتے ہی ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے تمام قبیح رسوم و عادات کو بالکل جڑ (بنیاد) سے اکھاڑ پھینکا اور صرف انہیں دستوروں کو باقی رکھا جو خود اس کی نظر میں مستحسن تھے۔

اگر اسلام عربوں کے جداگانہ نظامِ خانوادگی کو ناپسند کرتا تو اس کے لئے اس طریقہ کا استیصال چنداں دشوار نہ تھا۔ لیکن ایسا نہ کرتے ہوئے قرآن میں اس کا تذکرہ کرنا اور خاموشی سے گذر جانا اس طرز رہائش پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

۱۰- عملی مثالیں

رسول اکرمؐ اور اہل بیت طاہرینؑ کی زندگیوں میں ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات کے یہاں بھی جداگانہ خاندان کا طریقہ (اسلامی قیود و شرائط کے ساتھ) رائج تھا۔

سنہ ۳۵ عام الفیل میں مکہ میں قحط پڑا۔ حضرت ابوطالبؑ کثیر العیال تھے۔ رسالت مآبؐ نے یہ محسوس کیا کہ چچا تنگدستی کی وجہ سے پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ حضرت عباسؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے کہا آپ مالدار ہیں ابو طالبؑ کی مدد کیجئے، عباسؓ راضی ہوگئے۔ دونوں حضرت ابو طالبؑ کے پاس پہنچے

اور یہ طے پایا کہ علیؑ رسولؐ کے سپرد ہوں، جعفرؓ عباس کے گھر جائیں اور عقیل ابو طالبؑ کے پاس رہیں (بحارالانوار، ج ۳۸، ص ۲۹۴-۲۹۵)۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت رسالت مآبؐ اور حضرت ابو طالبؑ دونوں کا نظام خانہ داری علیحدہ تھا۔ اس کے باوجود یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دونوں حضرات (علیہما السلام) کے درمیان اس سے زیادہ محبت و شفقت و احترام پایا جاتا تھا جتنا ایک باپ اور بیٹے کے درمیان ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ سے جہاں جداگانہ نظامِ خانوادگی کی تائید ہوتی ہے وہاں اسلامی نظام کے دوسرے اہم پہلو سے "صلۂ رحم" پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اپنی زندگی کے آخری ماہ رمضان میں حضرت علیؑ کا یہ معمول تھا کہ ایک روز امام حسنؑ کے گھر افطار فرماتے تھے، دوسرے روز امام حسینؑ کے گھر اور تیسرے روز حضرت عبداللہ بن جعفر کے گھر افطار فرماتے تھے (بحارالانوار، ج ۴۲، ص ۲۲۴؛ ارشاد مفید، ص ۷)۔

یہ روایت بھی اسلامی نظام کے دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے:

خانہ داری کے علیحدہ انتظامات
اور صلۂ رحم۔

یہ دونوں روایتیں مسلمانوں کے گھریلو نظام کے متعلق ان کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس صراطِ مستقیم سے انحراف کرتا ہے تو پھر وہ اسلام کی شاہراہ سے بھی الگ ہو جائے گا۔

دوسرا باب: والدین اور اولاد کے حقوق اور ذمہ داریاں

۱۔ والدین اور اولاد

"آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعاً"

"تمہارے باپ ہو یا بیٹے تم نہیں جانتے ہو کہ ان میں سے کون تمہاری نفع رسانی میں زیادہ قریب ہے" (سورہ نسا، آیت ۱۱)۔

مذکورہ بالا آیۂ مبارکہ والدین اور اولاد کے باہمی تعلقات کے بارے میں اسلامی نظریہ کا بخوبی انکشاف کرتی ہے۔ اوائل زندگی میں جبکہ فطرت انسانی طفلی کے مراحل سے گذرتی رہتی ہے وہ ماں باپ ہی کی بے مثال محبت اور توجہ ہوتی ہے جو بچوں کو انتہائی بے بسی اور عاجزی کی منزل سے گذار کر پوری طاقت اور خود اعتمادی کے درجے تک پہنچاتی ہے۔

اس کے بالمقابل ضعیفی کے عالم میں انسان کودک نادان بن جاتا ہے، اس کا جسم و دماغ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

"وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ أَفَلَا يَعْقِلُونَ"

" ہم جس کو لمبی عمر عطا کرتے ہیں تو اسے خلقت میں الٹ (کر بچوں کی طرح مجبور کر) دیتے ہیں" (سورہ یس، آیت ۶۸)۔

اس وقت اسلام اولاد کو یاد دلاتا ہے کہ :

"هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ"

"بھلا نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ (سورہ رحمٰن، آیت ۶۰)۔

کل انہوں نے تمہاری عاجزی کو سہارا بخشا تھا آج تم ان کی شکستگی کو سنبھالو۔

۲۔ حقوق والدین کے بارے میں شدت تاکید کا سبب

یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے ہم کو قرآن یا احادیث میں اولاد کی پرورش و نگہداشت اور تربیت و پرداخت کے متعلق اتنی شدید تاکید نظر نہیں آتی جتنی حقوق والدین کا لحاظ رکھنے کے بارے میں پائی جاتی ہے۔آخر ایسا کیوں ہے؟

شارع اسلام نے اپنے اس طرز عمل سے صاحبان بصیرت کے لئے غور و فکر کرنے کی ایک نئی راہ کھول دی ہے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ یہ انداز ہدایت کتنا مطابق فطرت اور مبنی بر عقل ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ والدین کا دل محبت اولاد کا سرچشمہ ہوتا ہے اور یہ الفت روح حیوانی کے ساتھ ساتھ تمام رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ خود قرآن مجید نے کئی مقامات پر والدین کی اس محبت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کے برخلاف اولاد کو والدین سے اتنی محبت نہیں ہوتی ۔ خصوصاً اس وقت جب اولاد بڑی ہو کر والدین کی توجہ اور تربیت سے مستغنی ہو جائے۔ یہاں بات احترام اور عزت کی نہیں ہو رہی ہے۔ یہاں گفتگو ہے اس طرح کی فطری محبت کی جیسی والدین کو اولاد سے ہوتی ہے اور مشاہدہ اس فرق کا شاہد عادل ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ سیدھی شاہراہ پر راستہ بتانے والے نشانات کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اس چوراہے پر جہاں سے مختلف راہیں پھوٹتی ہیں اگر راستہ بتانے والے ان نشانات موجود نہ ہوں (یا کوئی رہنما ساتھ نہ ہو) تو کعبہ کے بجائے ترکستان جانے سے کون بچا سکتا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جن امور سے تغافل نہ برتنے پر فطرت خود احتساب کرتی ہے ان کے متعلق مذہب کو زیادہ نصیحت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ البتہ جہاں سے فطرت کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے وہاں اسلام دستگیری کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور انسان کو یہ بتا کر کہ اب اسے کدھر جانا ہے اور کیا کرنا ہے اسے صحیح راستے پر لگا دیتا ہے۔

اسی لئے شارع اسلام نے حقوق اولاد کے متعلق اتنی زیادہ فہمائش نہیں کی والدین کے حقوق پر بھرپور

زور دیا اور تاکید کی۔اس اجمال کی تفصیل آئندہ آرہی ہے۔

۳۔حقوق اولاد

ارشاد نبویؐ ہوتا ہے کہ :

"یَا عَلِيُّ یَلْزَمُ الْوَالِدَیْنِ مِنْ عُقُوقِ وَلَدِهِمَا مَا یَلْزَمُ الْوَلَدَ لَهُمَا مِنْ عُقُوقِهِمَا"؛ "اے علیؑ! والدین پر اولاد کے حقوق ویسے ہی لازم ہیں جیسے اولاد پر والدین کے حقوق لازم ہیں۔ (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۳۹۰ و ج۲۱؛ ص۴۸۰. الکافی، ج۶؛ ص۴۸۔ واضح رہے کہ مذکورہ حدیث اس طرح بھی نقل ہوئی ہے کہ : "یَلْزَمُ الْوَالِدَیْنِ مِنَ الْعُقُوقِ لِوَلَدِهِمَا إِذَا كَانَ الْوَلَدُ صَالِحاً مُؤْمِناً مَا یَلْزَمُ الْوَلَدَ لَهُمَا"؛ (الخصال، ج۱؛ ص۵۵؛ روضۃ الواعظین و بصیرۃ المتعظین، ج۲؛ ص۳۶۷)۔ البتہ کتاب الخصال میں اولاد کے "صالح" ہونے کے ساتھ "مومن" ہونے کی قید نہیں ذکر ہوئی ہے)۔

حقوق و فرائض لازم و ملزوم ہیں۔اس کا فریضہ دوسرے کا حق ہے۔ اگرچہ والدین کی فطری محبت اولاد کی بہبودی اور پرورش و نگہداشت کی معتبر ضامن تھی۔اس کے باوجود اسلام نے اس سلسلہ میں جو لائحہ عمل مرتب کر کے ہمیں دیا ہے وہ قابل وجد ہے۔

پیدائش سے لے کر جوانی تک حیات انسانی میں چند ایسے اہم موڑ آتے ہیں جن میں بے سوچے سمجھے ایک قدم بھی بڑھانا دنیا اور آخرت کی کامیابی اور خوشی کو برباد کر دیتا ہے۔ان میں سب سے اہم منزل تعلیم اور اخلاقی تربیت کی ہے۔آئندہ سطور میں ان دو امور سے متعلق چند اسلامی ہدایات پیش کی جارہی ہیں جن سے بانیٔ اسلام کے منشاء اور مرضی کا اندازہ کیا جاسکے گا۔

الف-اچھا نام رکھنا

امیر المومنین علیؑ نے ارشاد فرمایا:

"أَوَّلُ مَا یَبَرُّ الرَّجُلُ وَلَدَهُ أَنْ یُسَمِّیَهُ بِاسْمٍ حَسَنٍ فَلْیُحْسِنْ أَحَدُكُمُ اسْمَ وَلَدِهِ"

"اولاد کے ساتھ انسان کی سب سے پہلی نیکی یہ ہے کہ اسے اچھے نام سے موسوم کرے۔پس تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی اولاد کا عمدہ نام رکھے (الکافی ، ج۶ ؛ ص۱۸؛ وسائل الشیعۃ ، ج۲۱، ص۳۸۹)۔

یہ حقیقت ہے کہ اچھا نام انسان کے نفسیات پر اچھا اثر ڈالتا ہے۔بچہ مختلف آدمیوں کی زبان سے اپنا نام دن رات سنتا رہتا ہے اور یہ سمجھنے کے وجوہ موجود ہیں کہ وہ نام جس قسم کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے دماغ کے تحت الشعوری پردوں میں اسی قسم کی صفات کو تقویت پہنچتی ہے۔کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی خراب آدمی کا نام اچھا نہ تھا۔ نہیں! ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ نام انسان کی شخصیت پر ایک معتد بہ (بہت

زیادہ) اثر ڈالتا ہے ہے بشرطیکہ ماحول یا تربیت اس اثر کو زائل نہ کر دے۔

خراب نام رکھنے میں ایک اور قباحت ہے۔جب بھی کوئی اس شخص کو اس نام سے پکارے گا اسے شرمندگی محسوس ہوگی اور نام ایک مستقل کوفت بن کر رہ جائے گا۔یہ مسلسل خلش اسے معاشرہ سے بیزار کرسکتی ہے۔اسی لئے بہت سی احادیث میں اچھا نام رکھنے کے لئے بہت ہی تاکید وارد ہوئی ہے۔

رسالت مآبؐ تو اس کا اتنا لحاظ رکھتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

"أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله كَانَ يُغَيِّرُ الْأَسْمَاءَ الْقَبِيحَةَ فِي الرِّجَالِ وَ الْبُلْدَانِ"

"آنحضرتؐ آدمیوں اور شہروں کے خراب ناموں کو بدل دیا کرتے تھے" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۳۹۰)۔

اس کی پرزور سفارش کی گئی ہے کہ بچوں کا نام یا تو رسولؐ و آل رسولؑ کے ناموں اور القاب پر مبنی ہو یا اس سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت و ربوبیت اور بچہ کی بندگی ظاہر ہو۔حیرت یہ ہے کہ آج کل لوگ اپنے بچوں کا نام فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے نام پر رکھتے ہیں۔یہ ذہنیت اس فکری بیماری کی نشاندہی کرتی ہے جس کی جڑیں ہمارے معاشرے میں راسخ ہوتی جارہی ہیں۔یہ رجحان یہ اعلان کررہاہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور اپنی طرزفکر میں بانئ اسلامؐ اور ان کی آل اطہارؑ سے اپنا رشتہ توڑ بیٹھے ہیں۔اب ہماری نظر میں ایسے افراد زیادہ اہمیت اور عظمت حاصل کرچکے ہیں جن کی زندگی اسلامی اصول کے بالکل برعکس بسر ہو رہی ہے۔اور جو کسب معاش کے لئے حرام اور ناجائز ذرائع اختیار کئے ہوئے ہیں۔اپنے بچوں کو ان کے ناموں سے موسوم کرکے ہم ان نونہالوں کو تعلیم دے رہے ہیں کہ ان کو بھی اپنی عملی زندگی میں اسلام اور اس کے ہدایات کی پابندی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ب۔ بچوں اور نوجواں کی زندگی کے تین دور

بچپن سے لے کر ۲۱۔ ۲۲ برس کے سن تک انسانی زندگی تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے:

پہلا دور: پیدائش سے سات برس تک

قدیم حکماء نے دماغی نشوونما کا مطالعہ کرکے یہ رائے قائم کی کہ رضاعت (دودھ پینے کے زمانے) کے بالکل ابتدائی دنوں میں انسانی عقل بالکل سادہ ہوتی ہے اور ہر قسم کے ادراکات سے معرا (خالی) رہتی ہے۔پھر آہستہ آہستہ وہ بدیہیات اور پیش پا افتادہ چیزوں کا ادراک کرنے لگتی ہے۔اور اسم کو مسمّٰی کے ساتھ مربوط کرنے لگتی ہے۔مگر ابھی اس میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ عقلی دلیلوں اور نظریات کا بار برداشت کرسکے۔ان حکماء نے ان تدریجی ترقیوں کے لئے عمر کی کوئی حد مقرر نہیں کی تھی اور واقعاً کوئی قطعی تعیّن بہت ہی دشوار ہے۔مگر موجودہ حکماء اور

فلاسفہ نے مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے کہ عموماً بچوں کا دماغ سات آٹھ برس کی عمر تک اس قابل نہیں ہوتا کہ اس پر کتابی تعلیم کا بوجھ ڈالا جائے ۔اور جو بچے اس ننھی سی عمر میں کتاب رٹنے کے لئے بٹھا دیئے جاتے ہیں ان کی دماغی صلاحیت مرجھا کر رہ جاتی ہے اور وہ مضر تقلید کا شکار ہو کر اپنی ذاتی عمر کھو بیٹھتے ہیں۔

دوسرا دور: آٹھ برس سے چودہ برس تک

اب دوسرا دور آتا ہے جس میں دماغ معقولات و نظریات کا استقبال کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ تعلیمی شوق کے شباب کا یہی دور ہے جب کہ ہر چیز کی کنہ (گہرائی) اور لِمْ (علت) معلوم کرنے کی دھن چھائی رہتی ہے۔اس زمانے میں دماغ جس طرح تروتازہ ہوتا ہے اور جیسی صلاحیتِ تعلیم اس دور میں ملتی ہے پھر نظر نہیں آتی۔اس کا سبب یہ ہے کہ وہ جذبۂ تجسّس جو انسان کو نامعلوم وادیوں کی طرف قدم بڑھانے پر اکساتا ہے پوری طرح آزاد ہوتا ہے اور علائق دنیاوی اور مختلف قسم کی ذمہ داریاں پاؤں کی زنجیر نہیں بنتیں۔

تیسرا دور: چودہ پندرہ برس کے بعد

چودہ پندرہ برس کے بعد عقل ایک حد تک پختہ ہو جاتی ہے ابتدائے بلوغ کا دور نگاہ کے سامنے نئے افق کھولتا ہے۔ جنسی جذبہ، شادی، گھریلو زندگی اور اس کے پیچیدہ مسائل پر غور و خوض سے شروع ہو جاتا ہے چونکہ تاہلی (ازدواجی) زندگی بسر کرنے کی منزل روز بروز قریب آتی جاتی ہے اس لئے سودائے مستقبل اور کل کی فکر ہر وقت دماغ پر چھائی رہتی ہے۔ کل جو بچہ تھا اب جوان کہلاتا ہے۔اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب بہت جلد اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے کیونکہ ہر گزرتا ہوا دن اسے اس منزل سے قریب کر رہا ہے جہاں ایک خانوادہ کی ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر آ جائیں گی۔

یہ خیالات اس کو کسب معاش کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانے کے لئے مہمیز (آمادہ) کرتے ہیں اور وہ اس کے لئے کسی مناسب طریقہ کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔

ان تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ احادیث معصومینؑ پر نظر ڈالیں اور ملاحظہ فرمائیں کہ نفسیات کے جن اسرار کا انکشاف ماہرین علم النفس نے سینکڑوں تجربات کے بعد کیا ہے انہیں یہ حکمائے ربانی چودہ سو برس پہلے کس طرح بیان کر گئے ہیں جیسے یہ باتیں ان کے لئے اجلی البدیہات (بالکل روشن) تھیں۔

(۱) حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا کہ:

" دَعِ ابْنَکَ یَلْعَبْ سَبْعَ سِنِینَ وَ الْزَمْهُ نَفْسَکَ سَبْعَ سِنِینَ فَإِنْ أَفْلَحَ وَ إِلَّا فَإِنَّهُ مَنْ لَا خَیْرَ فِیهِ"۔

"اپنے بچے کو سات برس چھوڑ دو کہ کھیلتا رہے (یہ پہلا دور ہے) اور سات برس اپنی نگرانی میں رکھو (یہ تعلیم و تربیت کا دوسرا دور ہے) پس اگر اس عرصے میں وہ فلاح پا جائے تو بہتر ہے ورنہ سمجھ لو کہ اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے"۔(وسائل الشیعۃ؛ ج۲۱؛ ص ۴۷۳؛الکافی، ج۶؛ص ۴۶)۔

(۲) حضرت رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا:

"اَلْوَلَدُ سَيِّدٌ سَبْعَ سِنِينَ وَ عَبْدٌ سَبْعَ سِنِينَ وَ وَزِيرٌ سَبْعَ سِنِينَ فَإِنْ رَضِيتَ خَلاَئِقَهُ لِإِحْدَى وَ عِشْرِينَ سَنَةً وَ إِلاَّ ضُرِبَ عَلَى جَنْبَيْهِ فَقَدْ أَعْذَرْتَ إِلَى اللهِ"۔

"لڑکا سات برس تک سردار ہے اور پھر سات برس تک غلام ہے اور پھر سات برس تک وزیر ہے۔پس اگر اکیس برس کے اندر اس کی عادتیں پسندیدہ بن گئیں تو خیر ہے ورنہ اسے اس کی راہ چھوڑ دو کیونکہ تم نے خدا کی بارگاہ میں اپنا عذر تمام کر دیا" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱، ص۴۷۶)۔

چونکہ کھیل کود کا زمانہ بے فکری کا ہوتا ہے اس لئے اسے "سرداری" کا زمانہ کہا گیا ہے اور تعلیم و تربیت میں والدین اور اساتذہ کا پابند رہنا پڑتا ہے اس لئے اس کی تعبیر "غلامی" سے کی گئی ہے اور تیسرے دور میں چونکہ کسب معاش کے سلسلے میں باپ کا ہاتھ بٹانے کی امید کی جاتی ہے اس لئے "وزیر" کی لفظ استعمال کی گئی ہے۔

ان میں سے ہر دور کے متعلق شریعت اسلامیہ نے دستور العمل بنائے ہیں۔

ج۔ تینوں مراحل کے متعلق ہدایات

الف۔ پہلے دور کے متعلق ہدایات

یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ پہلے دور میں دماغ کتابوں کا بار برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اتنے عرصے تک دماغ معطل رہتا ہو۔بلکہ وہ غیر شعوری طور پر ہر وقت ماحول سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ بچوں کی تربیت اور اٹھان پر کامل توجہ مبذول رکھی جائے۔

خود بچوں کے ساتھ مہذبانہ برتاؤ تہذیب و اخلاق سکھانے کا سب سے عمدہ طریقہ ہے۔اس طرح بچے آداب مجلس، عمدہ اخلاق اور شریفانہ برتاؤ بہت آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"أَكْرِمُوا أَوْلاَدَكُمْ وَ أَحْسِنُوا آدَابَهُمْ يُغْفَرْ لَكُمْ"۔

"اپنی اولاد کا اکرام کرو اور ان کو اچھے آداب سکھاؤ، خدا تمہیں بخش دے گا" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۴۷۶)۔

اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ بچوں کو اچھے ماحول میں رکھا جائے رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

''يا عَلِيُّ حَقُّ الْوَلَدِ عَلَى وَالِدِهِ أَنْ يُحَسِّنَ اسْمَهُ وَ أَدَبَهُ وَيَضَعَهُ مَوْضِعاً صَالِحا''۔

''اے علیؑ ! باپ پر اولاد کے حقوق میں سے یہ ہے کہ... اس کو اچھے آداب سکھائے اور اسے موضع صالح (اچھی جگہ) میں رکھے'' (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۳۸۹-۳۹۰)۔

اسی سلسلے میں اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہنستے کھیلتے آہستہ آہستہ بچوں کی مذہبی تربیت بھی ہوتی رہے کیونکہ بچوں کے سادہ اذہان پر جو نقوش کمسنی میں ابھر آتے ہیں ان کو بعد میں مٹانا آسان نہیں ہوتا۔ اگر اس عمر میں ان کے ذہنوں پر مذہب کا احترام اور محبت ترسیم ہو جائے تو بچے ہمیشہ مذہب سے وابستہ رہیں گے۔

مندرجہ ذیل روایت اس دور میں مذہبی تربیت کا نصاب یوں معین کرتی ہے:

عن عبداللہ بن فضال عن احداھماعلیہ السلام: ''إِذَا بَلَغَ الْغُلَامُ ثَلَاثَ سِنِينَ يُقَالُ لَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ثُمَّ يُتْرَكُ حَتَّى يَتِمَّ لَهُ ثَلَاثُ سِنِينَ وَ سَبْعَةُ أَشْهُرٍ وَ عِشْرُونَ يَوْماً فَيُقَالُ لَهُ قُلْ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ص سَبْعَ مَرَّاتٍ وَ يُتْرَكُ حَتَّى يَتِمَّ لَهُ أَرْبَعُ سِنِينَ ثُمَّ يُقَالُ لَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ قُلْ صَلَّى اللَّهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ ثُمَّ يُتْرَكُ حَتَّى يَتِمَّ لَهُ خَمْسُ سِنِينَ ثُمَّ يُقَالُ لَهُ أَيُّهُمَا يَمِينُكَ وَ أَيُّهُمَا شِمَالُكَ فَإِذَا عَرَفَ ذَلِكَ حُوِّلَ وَجْهُهُ إِلَى الْقِبْلَةِ وَ يُقَالُ لَهُ اسْجُدْ ثُمَّ يُتْرَكُ حَتَّى يَتِمَّ لَهُ سِتُّ سِنِينَ فَإِذَا تَمَّ لَهُ سِتُّ سِنِينَ صَلَّى وَ عُلِّمَ الرُّكُوعَ وَ السُّجُودَ حَتَّى يَتِمَّ لَهُ سَبْعُ سِنِينَ فَإِذَا تَمَّ لَهُ سَبْعُ سِنِينَ قِيلَ لَهُ اغْسِلْ وَجْهَكَ وَ كَفَّيْكَ فَإِذَا غَسَلَهُمَا قِيلَ لَهُ صَلِّ ثُمَّ يُتْرَكُ حَتَّى يَتِمَّ لَهُ تِسْعٌ فَإِذَا تَمَّتْ لَهُ عُلِّمَ الْوُضُوءَ وَ ضُرِبَ عَلَيْهِ وَ عُلِّمَ الصَّلَاةَ وَ ضُرِبَ عَلَيْهَا فَإِذَا تَعَلَّمَ الْوُضُوءَ وَ الصَّلَاةَ غَفَرَ اللَّهُ لِوَالِدَيْهِ''۔

عبداللہ بن فضال پانچویں یا چھٹے امام (علیہما السلام) سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''جب لڑکا تین برس کا ہو جائے تو اس سے سات مرتبہ کہا جائے کہ: ''لا الہ الا اللہ'' کہو۔ پھر اسی حال پر چھوڑ دیا جائے، یہاں تک کہ تین برس سات مہینہ بیس دن کا ہو جائے، اس وقت سات مرتبہ ''محمد الرسول اللہ'' کہنا سکھایا جائے۔ پھر چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ پورے چار سال کا ہو جائے اس وقت سات مرتبہ ''صلی اللہ علی محمد وآلہ محمد'' کہلوایا جائے۔ پھر چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ پانچ برس کا ہو جائے، اس وقت پوچھا جائے کہ ''تیرا دایاں ہاتھ کونسا ہے اور بایاں کونسا ہے؟'' جب یہ پہچان لے تو اس کو قبلہ رخ کر کے ''سجدہ'' کا حکم دیا جائے پھر چھوڑ دیا جائے۔ یہاں تک کہ چھ برس پورے ہو جائیں اس وقت اس سے ''نماز'' پڑھنے کو کہا جائے اور رکوع و سجود سکھایا جائے۔ جب سات سال پورے ہو جائیں تو اس سے کہا جائے کہ ''چہرہ اور دونوں ہاتھ دھو کر نماز پڑھو''۔ پھر اسی حال پر چھوڑ دیا

جائے یہاں تک کہ پورے نو برس کا ہو جائے۔اس وقت اس کو باقاعدہ وضو سکھایا جائے اور اس (کے ترک) پر مارا جائے اور باقاعدہ نماز سکھائی جائے اور اس (کے ترک) پر مارا جائے ۔پس جب وہ اس طرح وضواور نماز سیکھ لے گا تو خدا اس کے والدین کو بخش دے گا" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱، ص ۴۷۴)۔

اس روایت کا ایک ایک فقرہ قابل غور ہے کیونکہ تدریجی طور پر بچوں کو شریعت کی پابندی سکھائی جارہی ہے۔بغیر اس کے کہ ان کے ذہنوں پر بے جا دباؤ ڈالا جائے۔ویسے بچوں کو دس بارہ سال کی عمر میں بھی تین چار دن کی توجہ میں وضو اور نماز سکھائی جاسکتی ہے لیکن اس تعلیم سے وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے ہیں جو زمانۂ طفلی کی اس زینہ بہ زینہ تربیت میں مضمر ہیں۔

ب۔ دوسرے دور کے متعلق ہدایات

اب باضابطہ تعلیم کا دور شروع ہوتا ہے۔منازل حیات میں یہ سب سے اہم منزل ہے جو مستقبل کا سنگ بنیاد ہے۔اسلام بتاتا ہے کہ اس دور میں پہلے بچوں کو بقدر واجب دینی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اعتقاد اور عمل میں گمراہیوں سے محفوظ رہ سکیں۔

امام صادقؑ ارشاد ہے:

"بَادِرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالْحَدِيثِ قَبْلَ أَنْ يَسْبِقَكُمْ إِلَيْهِمُ الْمُرْجِئَةُ"؛ "اپنے بچوں کو حدیث کی تعلیم دینے میں جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ مرجئہ (ایک گمرہ فرقہ) تم سے پہلے ان تک پہنچ جائیں" (الکافی، ج۶، ص ۴۷۔ واضح رہے کہ بعض مقامات پر "حدیث" کی جگہ لفظ "احکام" بھی آیا ہے)۔

مقصد یہ ہے کہ الحاد و بے دینی سکھانے والے درسی نصاب کا اثر دماغ پر چھا جائے اس سے پہلے انہیں دین و مذہب میں راسخ (مضبوط) کردو۔ بچے ہری ٹہنی ہوتے ہیں جدھر موڑا جائے گا مڑ جائیں گے۔اگر اس کی عمر میں انہیں مذہبی تعلیم سے بے بہرہ رکھا گیا تو پھر نام نہاد "غیر مذہبی" (اور حقیقتاً کافرانہ) نظام تعلیم کے زہریلے اثرات سے انہیں خدا ہی بچائے تو بچائے آئے۔

افسوس ہے کہ ہم آج اس ہدایت سے غافل ہوگئے ہیں۔ایک زمانہ تھا جب بچوں کے لئے قرآن مجید اور مذہبیات کی ابتدائی تعلیم لازمی سمجھی جاتی تھی ۔مگر وائے بر حال ما کہ آج ہمارے بیشتر نونہال سن شعور تک پہنچتے پہنچتے ایسی درسگاہوں میں داخل کر دیئے جاتے ہیں جہاں ان کے دماغ پر شب و روز مخالف مذہب پروپیگنڈا کا اثر غیر محسوس طور پر پڑتا رہتا ہے۔اور یہی بیج عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتے بڑھتے لا مذہبیت کا تناور درخت بن جاتا ہے۔

ایام جوانی میں مجھے سادات کی ایک بستی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ اچھے

خاصے عمر رسیدہ افراد اصول دین کی تعداد اور ائمہ معصومینؑ کے اسمائے گرامی تک سے واقف نہیں۔ طول و عرض ہند و پاک میں کتنی بستیاں ایسی ہوں گی، یہ تصور انسان کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ خداوند کریم ان حضرات اور ان اداروں اور تنظیموں کی توفیقات میں اضافہ فرمائے جو بچوں کی دینی تعلیم کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔

بانیٔ اسلام نے لڑکوں کی تعلیم کے لئے دو باتوں پر زور دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"حَقُّ الْوَلَدِ عَلَى وَالِدِهِ إِذَا كَانَ ذَكَراً . . . وَ يُعَلِّمَهُ كِتَابَ اللهِ وَ يُطَهِّرَهُ وَ يُعَلِّمَهُ السِّبَاحَةَ"۔

"لڑکے کا حق باپ پر یہ ہے کہ... اسے کتاب خدا کی تعلیم دے اور تیرنا اور شہسواری سکھائے (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۴۸۱)۔

امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ باپ کا فریضہ ہے کہ:

". . . وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتَابَةَ . . ."؛ "...لڑکے کو لکھنا سکھائے..." (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۴۸۲)۔

ان روایتوں سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینیات، فنون جنگ اور کتابت کو لڑکوں کے نصاب تعلیم میں لازمی طور پر شامل کرنا چاہئے۔ ان مضامین کے علاوہ جو معلوم لڑکے کی افتاد طبع سے مناسبت رکھتے ہوں یا کسب معاش کے لئے ضروری ہوں ان کو بھی سکھانا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ تینوں چیزیں لازمی مضامین کی حیثیت رکھتی ہیں اور بقیہ علوم اختیاری ہیں۔

لڑکیوں کے لئے الگ نصاب مقرر کیا گیا ہے مذکورہ بالا حدیث نبویؐ کا تتمہ یہ ہے:

"وَ إِذَا كَانَتْ أُنْثَى أَنْ . . . يُعَلِّمَهَا سُورَةَ النُّورِ- وَ لَا يُعَلِّمَهَا سُورَةَ يُوسُفَ وَ لَا يُنْزِلَهَا الْغُرَفَ"۔

"اگر اولاد لڑکی ہو تو اس کا حق یہ ہے کہ... اسے سورۂ نور کی تعلیم دے، سورۂ یوسف نہ پڑھائے اور اسے چھت پر نہ جانے دے" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۴۸۱)۔

اس روایت کا ماحاصل دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ لڑکیوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ چراغ خانہ بنیں، شمع محفل نہ بن جائیں۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے آپ جو تعلیم بھی انہیں دیں گے جائز ہوگی۔

البتہ حصول علم کے لئے بھی حجاب کی پابندی ضروری ہے اور تعلیم کے لئے ایسے سبجکٹ (Subject) انتخاب کئے جائیں جن میں شرعاً کوئی قباحت نہ ہو۔

ج۔ تیسرے دور کے متعلق ہدایات

تیسرا دور کسب معاش اور اس کی تیاریوں کا دور ہے۔ لیکن اسے فی الحال یہاں بیان کرنے کا محل نہیں ہے۔

اسی دور میں اولاد کی شادی کا وقت آتا ہے۔اس کے متعلق بھی شریعت نے ہدایات دی ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کی شادی میں جلدی کرنے کی بے انتہا تاکید کی گئی ہے۔رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے کہ لڑکی کا حق باپ پر یہ ہے کہ:

"وَيُعَجِّلَ سَرَاحَهَا إِلَى بَيْتِ زَوْجِهَا"۔

"اسے شوہر کے گھر رخصت کرنے میں جلدی کرے" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۴۸۱)۔

بے حد رنج ہوتا ہے جب یہ دیکھتا ہوں کہ بہت سے مسلمان (اور بالخصوص ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان) اس ذمہ داری کے سلسلے میں بہت ہی بے توجہی اور لاپرواہی بھرتے ہیں یہاں تک کہ ان کی لڑکیاں ۳۵-۴۰ برس کی ہو جاتی ہیں اور اس وقت کوئی شخص ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ شادی میں تاخیر کے نقصانات اظہر من الشّمس ہیں اور ہر شخص اس غیر ذمہ دارانہ پدری رویہ کی برائیوں کو محسوس کرتا ہے۔ مگر جھوٹا جذبۂ تفوّق ایسے ماں باپ کو اس حقیقت سے غافل کئے رہتا ہے۔یہ تفوّق کا احساس کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یا تو مالی برتری کا احساس ہوتا ہے یا ذات اور خاندان کی برتری کا گھمنڈ ہوتا ہے؟۔ ان دونوں چیزوں کے گھمنڈ کی قربان گاہ پر بیٹیوں کی زندگی قربان کر دی جاتی ہے اور وہ "بوڑھی کنواریاں" بن کر رہ جاتی ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ اگر نوجوان مومن کا پیغام آئے جو اخلاق اور سیرت اور مذہب کی پابندی کے لحاظ سے قابل اعتماد ہو تو اس کا پیغام قبول کر لیا جائے اگرچہ وہ مالی اور خاندانی لحاظ سے لڑکی کے والدین کا ہم پلہ نہ ہو۔ رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے کہ:

"الْمُؤْمِنُ كُفْوُ الْمُؤْمِنَةِ وَ الْمُسْلِمُ كُفْوُ الْمُسْلِمَةِ"۔

"ہر مومن، مومنہ کا کفو ہے اور ہر مسلمان، مسلمہ کا کفو ہے" (وسائل الشیعۃ، ج۲۰؛ ص۶۷-۶۸)۔

مگر ہندوؤں کے ذات پات کے تمدن نے ہم مسلمانوں کے دل و دماغ پر ایسا تسلط حاصل کر لیا ہے کہ ہم اپنے روشن اسلامی تمدن و تہذیب کو خود حقیر سمجھنے لگے ہیں۔ خدا رحم کرے۔

مذکورہ بالا حدیث میں لڑکوں کے متعلق یہ ملتا ہے کہ:

"وَيُزَوِّجُهُ إِذَا بَلَغَ"

"جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کر دے" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۴۸۲)۔

مگر اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ لڑکا پندرہ برس کا ہو جائے تو فوراً اس کی شادی کر دی جائے خود رسالتمآبؐ کا پہلا عقد ۲۵ برس کے سِن میں ہوا تھا۔ اسی طرح امیر المومنینؑ کا عقد بھی ۲۵ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ مگر یہ بھی کوئی قاعدۂ کلیہ نہیں

ہے۔اس کا اصول صرف یہ ہے کہ جب انسان میں جذبات شباب پختہ ہو جائیں اور اس میں متاہلانہ زندگی بسر کرنے کی طرف رغبت پیدا ہو جائے اس وقت اس کی شادی بلاتاخیر کر دی جائے۔ یہ وہ معیار ہے جس کے لئے نہ عمر کی تعیین کی جاسکتی ہے اور نہ سِن کی قید لگائی جاسکتی ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر اولاد کے متعلق والدین کی اہم ذمہ داریاں ختم ہو جاتی ہیں۔اگر کوئی شخص ان شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اولاد کی پرورش کرے اور کامیاب ہو جائے تو یقیناً اولاد راحتِ دل اور خنکیٔ چشم بنے گی اور ایسی ہی اولاد کے متعلق رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اَلْوَلَدُ الصَّالِحُ رَيْحَانَةٌ مِنْ رَيَاحِينِ الْجَنَّةِ"۔

"صالح اولاد جنت کے پھلوں میں سے ایک پھول ہے" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۳۵۸)۔

نیز انہیں حضرتؐ نے فرمایا ہے:

"مِنْ سَعَادَةِ الرَّجُلِ اَلْوَلَدُ الصَّالِحُ"۔

"صالح اولاد انسان کی ایک سعادت ہے" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۳۵۹)۔

۳۔ حقوق والدین

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"بِعِزَّتِي وَ جَلَالِي وَ ارْتِفَاعِ مَكَانِي، لَوْ أَنَّ الْعَاقَّ لِوَالِدَيْهِ تَأْتِي بِأَعْمَالِ الْأَنْبِيَاءِ جَمِيعاً لَمْ أَقْبَلْهَا مِنْهُ"۔

"مجھے اپنے عزت وجلال اور رفعت شان کی قسم ہے کہ اگر عاق والدین میرے پاس تمام انبیاء کے اعمال لے کر آئے تو بھی میں اسے قبول نہیں کروں گا" (انوار الہدایۃ؛ بحار الانوار، ج۴۷، ص۸۰)۔

اولاد جیسے جیسے جوانی کی طرف قدم بڑھاتی ہے والدین ضعیفی کی منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ماں باپ کی محبت اور شفقت اولاد کی پرورش اور تربیت میں ان کی زحمتوں کا لازمی اور فطری تقاضا یہ ہے کہ اولاد والدین کی اطاعت اور اعانت میں کبھی کوتاہی نہ کرے۔

اس عالم اسباب میں والدین ہی اولاد کے وجود کی علّت ہوتے ہیں، وہی اس کی حفاظت اور بقاء کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، وہی اس کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے کسی امکانی کوشش سے دریغ نہیں کرتے۔خدائے واحد و یکتا کے بعد اگر انسانی زندگی، بقا اور کمال کسی کا مرہون منت ہے تو وہ والدین کی ذات ہے۔دوسروں لفظوں میں والدین ہمارے "ربِّ مجازی" ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے کئی آیتوں میں خدا کی عبادت اور والدین کی اطاعت کو پہلو بہ پہلو ذکر کیا ہے:

"وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً"۔

"اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ قرار دو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو" (سورہ نسا، آیت ۳۶)۔

"وَ قَضىٰ رَبُّكَ أَلاّٰ تَعْبُدُوا إِلاّٰ إِيّٰاهُ وَ بِالْوٰالِدَيْنِ إِحْساناً"۔

"اور تیرے رب نے یہ حکمِ محکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو" (سورہ اسرا، آیت ۲۳)۔

۴-حقوق کے والدین کا تجزیہ

میں نے جہاں تک غور کیا ہے والدین کی ربوبیت کو ہر عمر میں خدا کی ربوبیت کا آئینہ دار پایا ہے۔ بچہ کی پیدائش ہو یا رضاعت، نگہداشت ہو یا تربیت۔ ہر منزل میں ماں باپ ہی وہ وسیلہ ہیں جن کے ذریعہ سے اللہ تعالی کا فضل و انعام بچہ تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح حقوق کی نوعیت میں بھی بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔

خداوند عالم کے حقوق کی تین قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں:

۱۔ اوّل وہ حقوق جو "نفس" سے متعلق ہیں۔ مثلاً معرفت باری۔

۲۔ دوسرے وہ حقوق جو "جسم" سے متعلق ہیں۔ مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ۔

۳۔ تیسرے وہ حقوق جو "مال" سے متعلق ہیں۔ مثلاً زکوۃ اور خمس وغیرہ۔

حقوق والدین کی بھی بعینہٖ یہی تین قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں:

آیئے پہلے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت پر نظر ڈالیں (جس کے ساتھ امام جعفر صادقؑ کی بیان کردہ تفسیر قوسین کے درمیان درج کی گئی ہے):

"وَ قَضىٰ رَبُّكَ أَلاّٰ تَعْبُدُوا إِلاّٰ إِيّٰاهُ وَ بِالْوٰالِدَيْنِ إِحْساناً إِمّٰا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمٰا أَوْ كِلاٰهُمٰا فَلاٰ تَقُلْ لَهُمٰا أُفٍّ وَ لاٰ تَنْهَرْهُمٰا وَ قُلْ لَهُمٰا قَوْلاً كَرِيماً۔ وَ اخْفِضْ لَهُمٰا جَنٰاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمٰا كَمٰا رَبَّيٰانِي صَغِيراً"(سورہ اسرا، آیت ۲۳و۲۴)۔

"اور تیرے رب نے یہ حکمِ محکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو (ان سے اچھا سلوک کرو اور انہیں اس بات کی زحمت نہ دو کہ اپنی احتیاج تم سے بیان کریں بلکہ اس کے قبل ہی ان کی ضروریات کو پورا کردو اگرچہ فی الحقیقت وہ تم سے مستغنی ہوں) اور تمہارے سامنے ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کی منزل تک پہنچ جائیں (اور تم پر خفا ہوں) تو ان سے "اف" تک نہ کرو اور (اگر تمہیں ماریں تو) انہیں مت جھڑکو (بلکہ ایسے موقع پر بھی) ان سے اچھے طریقے سے بات کرو (یعنی یہ کہو کہ خدا آپ لوگوں کو بخشش

دے) اور ان کے سامنے رحمت کے ساتھ خاکساری کا پہلو اختیار کرو (اور ان پر جب بھی نظر کرو نرمی اور رحم رحمت کے ساتھ دیکھو۔ نہ تو اپنی آواز ان کی آواز پر بلند کرو، نہ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے اونچا کرو اور نہ ان کے آگے قدم بڑھاؤ) اور یہ کہا کرو کہ: اے پالنے والے! جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما" (وسائل الشیعۃ؛ ج۲۱؛ ص۴۸۸؛ الکافی، ج۲؛ ص۱۵۸)۔

اس تفسیر نے حقوق کے والدین کی تینوں قسموں کی تشریح کر دی ہے۔اور ذرا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

والدین کی سختیوں کو برداشت کر لینا، گفتگو میں نرمی اور آہستگی سے کام لینا، ان پر پیش قدمی نہ کرنا، اور اپنا ہاتھ اور اپنی آواز ان کے ہاتھ اور ان کی آواز پر بلند نہ کرنا یہ سب حقوق جسمانی اطاعت کے زمرے میں آتے ہیں۔

اور ان کی طرف رحمت اور مہربانی سے دیکھنا اور ان کے لئے ہمیشہ استغفار کرتے رہنا قلبی محبت کا آئینہ دار ہے۔

اور ان کے کہنے سے پہلے ان کی حاجتوں کو پورا کر دینا مالی حقوق سے تعلق رکھتا ہے۔

اس طرح رب حقیقی اور ان ارباب مجازی کے حقوق کی مشابہت نقطۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اب میں روایات کی مدد سے کچھ مزید تفصیل پیش کرنا چاہتا ہوں چونکہ اس روایت مبارکہ میں پہلے مالی حقوق کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد محبت و اطاعت کے حقوق کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اس لئے میں بھی اولاً مالی حقوق کی تشریح کروں گا اس کے بعد محبت اور اطاعت کا ذکر کروں گا۔

۵۔ والدین کی ذات باری سے مشابہت مالی حقوق کے لحاظ سے

الف: پہلی مشابہت

رب حقیقی کے قبضہ میں صرف انسان اور اس کی دولت نہیں بلکہ ساری دنیا ہے۔ اور وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ انسانی دولت کے کسی حصے کا اپنے نام پر مطالبہ کرے۔ پھر بھی اس مالک نے بہ طور خراج اس دولت کا ایک حصہ اپنے لئے مقرر فرما دیا۔ لہٰذا یہ ضعیف البنیان ارباب مجازی تو واقعاً اس کا حق رکھتے ہیں کہ اپنی اولاد کی کمائی سے وہ بھی فائدہ اٹھائیں اور ان کو بھی اپنے لگائے ہوئے باغ کے ثمرات سے بہرہ یاب ہونے کا حق دیا جائے۔ اگر ان کو اس کی ضرورت نہ بھی ہو تب بھی ان کی مجازی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد ان کی خدمت میں اپنے طور پر خراج عقیدت پیش کرے۔ اسی لئے امام جعفر صادقؑ نے (مذکورہ تفسیر میں) ارشاد فرمایا ہے کہ "ان کی مالی اعانت کرو اگرچہ وہ تم سے مستغنی ہوں"۔

ب: دوسری مشابہت

باوجودیکہ خداوند تعالیٰ کو ہر انسان سے مالی خراج کے مطالبہ کا حق حاصل ہے لیکن اس نے اپنی رحمت سے اس خراج کو صرف انہیں لوگوں پر واجب کیا ہے جن کے پاس مال کی ایک خاص مقدار موجود ہو۔اور باقی سب کے لئے راہ خدا میں مال خرچ کرنے کو ایک استحبابی امر قرار دے کر جذبۂ عبودیت کے امتحان کا ایک وسیع میدان پیش کر دیا ہے۔اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یوں تو بالعموم ہر شخص کو والدین کی مالی اعانت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

"قُلْ مٰا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوٰالِدَيْنِ وَ الْأَقْرَبِينَ"۔

"اے رسولؐ ! ان لوگوں سے کہئے کہ جو مال بھی تم رضائے الٰہی کیلئے خرچ کرو اس کے اولین حقدار تمہارے ماں باپ ہیں ان کے بعد دوسرے اقارب وغیرہ (سورہ بقرہ، آیت ۲۱۵)۔

"وَوَصَّيْنَا الْإِنْسٰانَ بِوٰالِدَيْهِ إِحْسٰاناً"۔

"اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ احسان کرنے کی نصیحت کی" (سورہ احقاف، آیت ۱۵)۔

لیکن یہ نفقہ واجب اس وقت ہوتا ہے جب اولاد کو اتنی گنجائش ہو کہ اپنے اور اپنی زوجہ کے ضروری اخراجات پورا کرنے کے بعد بھی ان کی اعانت کر سکے نیز والدین میں اعانت کے محتاج بھی ہوں۔اور اگر ان دونوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو گئی تو والدین کا نفقہ واجب نہ رہے گا۔

لیکن وجوب کے ساقط ہو جانے کے بعد بھی تاکیدی استحباب اپنی جگہ پر باقی رہے گا۔اسی لئے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ:

"لَازِمٌ لَهُ ذٰلِكَ فِي الْعُسْرِ وَ الْيُسْرِ"۔

"یہ نفقے ثروت اور غربت دونوں حالتوں میں لازم ہیں" (وسائل الشیعۃ، ج۲۱؛ ص۵۱۵)۔

اس کے علاوہ والدین کو آرام پہنچانے کے سلسلے میں جتنی تاکید وارد ہوئی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور کوئی نتیجہ نکالا ہی نہیں جا سکتا۔

ج: تیسری مشابہت

عبادت الٰہی خیر و برکت کے نزول کا ایک اہم وسیلہ ہے۔حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو نصیحت فرمائی تھی:

"اِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كٰانَ غَفّٰاراً-يُرْسِلِ السَّمٰاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرٰاراً-وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوٰالٍ وَبَنِينَ وَ يَجْعَلْ لَكُمْ جَنّٰاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهٰاراً"۔

"اپنے پروردگار سے مغفرت کی دعا مانگو وہ بڑا بخشنے والا ہے تم پر آسمان سے موسلادھار با پانی برسائے گا اور مال و اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ بنائے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا" (سورہ نوح، آیت ۱۰-۱۲)۔

اسی طرح خداوندعالم نے والدین کے صلہ اور ان کی مالی اعانت کو بھی وسعت رزق اور طول عمر کا ذریعہ بنایا ہے تاکہ تنگ دست اولاد کم از کم وسعت رزق ہی کی تمنا اور امید میں خود اپنی خوشی سے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرتی رہے۔ رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُمَدَّ لَهُ فِي عُمُرِهِ وَ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ فَلْيَصِلْ أَبَوَيْهِ فَإِنَّ صِلَتَهُمَا مِنْ طَاعَةِ اللَّهِ"۔

"جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی عمر بڑھادی جائے اور رزق کشادہ کر دیا جائے تو وہ اپنے والدین کے ساتھ صلۂ رحم کرے کیونکہ ان کا صلہ خدا کی اطاعت کا ایک حصہ ہے" (بحار الانوار، ج۷۱؛ ص۸۵)۔

اسی مضمون کی ایک اور روایت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے جس میں طول عمر کے بجائے جان کنی کی سہولت کا ذکر ہے۔ اور بے شک خدا کے سب وعدے برحق ہیں۔

۶۔ حق محبت کے لحاظ سے

اس موضوع پر کچھ لکھنے سے قبل یہ عرض کردوں کہ ہمارے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ رسول و آل رسول (علیہم الصلوۃ والسلام) کی محبت خدا کی محبت کا ایک جزو ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر میں یہاں پر بہ راہ راست محبت خدا سے مشابہت دکھانے کے بجائے ایسی روایتیں پیش کرتا ہوں جن سے والدین کی محبت اہل بیتؑ کی محبت کے پہلو بہ پہلو نظر آئے گی۔

الف: پہلی مشابہت

شیعہ اور سنی دونوں کی مسلمہ حدیثوں کے مطابق حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کا دشمن یا تو منافق ہوگا یا ولد الحرام۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ فرمایا کرتے تھے:

"يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ أَدِّبُوا أَوْلَادَكُمْ عَلَى حُبِّ عَلِيٍّ (ع) فَمَنْ أَبَى فَانْظُرُوا فِي شَأْنِ أُمِّهِ"۔

"اے گروہ انصار! اپنی اولاد کو محبت علیؑ کی تعلیم دو۔ اور جو انکار کرے اس کی ماں کے حالات کی جانچ کرو" (بحار الانوار، ج۳۹؛ ص۳۰۰)۔

حضرت جابر کا یہ ارشاد حدیث نبویؐ سے ماخوذ ہے (انوار الہدایہ، جامع الاخبار، فصل ۴۰)۔

اب والدین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے بھی سن لیجئے:

"مَنْ ضَرَبَ أَبَوَيْهِ فَهُوَ وَلَدُ الزِّنَاء"۔

"جو اپنے والدین کو مارے وہ ولد الزنا ہے" (جامع الاخبار شعیری، ص۸۴)۔

ب: دوسری مشابہت:

جناب سیدہ (صلوات اللہ علیہا) کی شان میں یہ روایت مسلّم بین الفریقین ہے:

"فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي فَمَنْ آذَاهَا فَقَدْ آذَانِي وَ مَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللَّهَ"۔

"فاطمہ میرا ہی ایک ٹکڑا ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھ کو اذیت دی اور جس نے مجھ کو اذیت دی اس نے خدا کو اذیت پہنچائی" (مناقب آل اِبی طالب علیہم السلام (لابن شہرآشوب)، ج ۳؛ ص ۳۳۲)۔

بعینہٖ اسی طرح والدین کے متعلق ارشاد رسولؐ ہے:

"من اذی ابویه فقد اذانی و من اذانی فقد اذی اللّٰه و من اذی اللّٰه فهو ملعون فی التوراة و الانجیل و القرآن"۔

"جس نے اپنے والدین کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے خدا کو اذیت پہنچائی اور جس نے خدا کو اذیت پہنچائی وہ تورات و انجیل و زبور و قرآن میں معلون ہے" (انوار الہدایۃ)۔

اسی طرح رسالتمآبؐ نے اپنے کو اور امیرالمومنینؑ کو اس امت کا باپ کہا ہے:

"أَنَا وَ عَلِيٌّ أَبَوَا هَذِهِ الْأُمَّةِ"۔

"میں اور علیؑ امت کے دو باپ ہیں" (بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۹۵)۔

شاید اس تشبیہ کی یہ غرض بھی ہو کہ امت والدین کی عظمت کو اچھی طرح سمجھ لے۔

بہر حال ان تمام روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبت والدین بھی محبت الٰہی کا ایک جزو ہے اور جس طرح اہل بیت رسول (علیہم السلام) سے سرتابی کرنے والا خدا کا دشمن اور جنت سے محروم ہے اسی طرح والدین کو اذیت پہنچانے والا بھی خدا کا دشمن اور جنت سے محروم ہے۔

۷۔ حق اطاعت کے لحاظ سے

الف: پہلی مشابہت

محبت و اطاعت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر دل میں محبت کی شمع روشن ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اعضاء وجوارح پر نورِ اطاعت کا پرتو نہ پڑے۔ محبت و وفاداری کی مؤثر نصیحت و تلقین کے بعد وہ منزل آ جاتی ہے کہ اولاد کی توجہ والدین کی طرف موڑ دی جائے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس منزل پر بھی اللہ تعالیٰ نے والدین کی اطاعت کو اپنی اطاعت کا آئینہ دار بنادیا ہے۔ یہاں ان آیتوں کے علاوہ جن کو ابتدائے کلام میں ذکر کر چکا ہوں قرآن مجید کا یہ ارشاد بھی قابل غور ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَ يَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ"۔

"اللہ شرک کے گناہ کو ہرگز نہیں بخشے گا اور دوسرے گنہگاروں میں سے جس کو چاہے بخش دے گا (سورہ نساء، آیت ۴۸)۔

بعینہٖ اسی طرح والدین کے سلسلے میں حدیث قدسی میں ارشاد ہوتا ہے:

"قل للبارّ بوالدیه اعمل ما شئت فلن تدخل النار ابدا و قل العاق بوالدیه اعمل ما شئت فلن تدخل الجنة ابدا"۔

"(اے رسولؐ) والدین کی اطاعت کرنے والے سے کہہ دیجئے کہ جو تیرا جی چاہے کر کیونکہ تو ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں جا سکتا اور والدین کی نافرمانی کرنے والے سے کہہ دیجئے کہ تو جو عمل بھی کرے کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا" (انوار الہدایہ؛ بحار الانوار، ج ۷۴، ص ۷۴)۔

(اسی طرح کی ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ: لِيَعْمَلِ الْعَاقُّ مَا شَاءَ أَنْ يَعْمَلَ فَلَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ، جو شخص اپنے والدین کا عاق ہو وہ چاہے جو کام انجام بھی کرلے ہرگز جنت میں نہیں جاسکتا ہے (مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل، ج ۱۵، ص ۱۹۶ بحوالہ قطب راوندی، لب اللباب)۔

لیکن اتنا فرق یاد رکھنا چاہئے کہ چونکہ خداوند عالم کی ذات اقدس ہر حاکم سے بالاتر ہے لہٰذا اس کے احکام کبھی کسی کے حکم سے رد نہیں کئے جا سکتے اور والدین کی حکومت چونکہ حکم خدا پر مبنی اور امر الٰہی کے تابع ہے اس لئے اگر کسی موقع پر ان کا حکم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ٹکرائے تو اسے حسن وخوبی سے ٹال دینا پڑے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْناً عَلَى وَهْنٍ وَ فِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَ لِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ- وَ إِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفاً"۔

"اور ہم نے انسان کو ان کے ماں باپ کے متعلق نصیحت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ سہہ کے اسے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کی دودھ بڑھائی کی کہ میرا شکر ادا کر اور اپنے ماں باپ کا بھی اور میری ہی طرف (تم سب کو) پلٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تم سے اس لئے جھگڑیں کہ تم ایسی چیزوں کو میرا شریک قرار دو جن کے متعلق تمہیں کچھ علم بھی نہیں تو ان کی اطاعت نہ کرو البتہ دنیاوی زندگی میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے بسر کرو" (سورہ لقمان، آیت ۱۴-۱۵)۔

مندرجہ ذیل روایات کو اسی آیت کی تفسیر سمجھنا چاہیے کہ:

"إِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ أَمَرَ بِثَلَاثَةٍ مَقْرُونٍ بِهَا ثَلَاثَةٌ أُخْرَى أَمَرَ بِالصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ فَمَنْ صَلَّى وَ لَمْ يُزَكِّ لَمْ يَقْبَلْ مِنْهُ صَلَاتَهُ وَ أَمَرَ بِالشُّكْرِ لَهُ وَ لِلْوَالِدَيْنِ فَمَنْ لَمْ يَشْكُرْ وَالِدَيْهِ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ وَ أَمَرَ بِاتِّقَاءِ اللهِ وَ صِلَةِ الرَّحِمِ فَمَنْ لَمْ يَصِلْ رَحِمَهُ لَمْ يَتَّقِ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ"۔

امام رضاؑ نے فرمایا کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ:

"اللہ عزوجل نے تین چیزوں کا حکم دیا ہے اور انہیں تین دوسری چیزوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اس

نے نماز اور زکوۃ کا حکم ایک ساتھ دیا ہے اگر کوئی نماز پڑھے اور زکاۃ نہ دے تو اس کی نماز قبول نہ ہوگی۔ اور اس نے اپنے شکر اور والدین کے شکر کا ایک ساتھ حکم دیا ہے اس لئے اگر کوئی والدین کا شکر ادا نہ کرے تو اس نے اللہ کا شکر بھی ادا نہ کیا۔ اور اس نے تقوائے الٰہی اور صلۂ رحم کا حکم ایک ساتھ دیا ہے اس لئے اگر کسی نے صلۂ رحم نہ کیا تو اس نے خدا کا خوف بھی نہ کیا" (عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج۱؛ ص۲۵۸؛ بحار الانوار، ج۷۱، ص۶۸)۔

اسی طرح امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے:

"ثَلَاثٌ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لِأَحَدٍ فِيهِنَّ رُخْصَةً أَدَاءُ الْأَمَانَةِ إِلَى الْبَرِّ وَ الْفَاجِرِ وَ الْوَفَاءُ بِالْعَهْدِ لِلْبَرِّ وَ الْفَاجِرِ وَبِرُّ الْوَالِدَيْنِ بَرَّيْنِ كَانَا أَوْ فَاجِرَيْنِ"۔

"تین چیزیں جن کو خدائے عزو جل نے کسی بندے کو کسی حال میں چھوڑنے کی اجازت نہیں دی ہے؛ امانت کو اس کے مالک تک پہنچانا چاہئے وہ (مالک) نیکوکار ہو یا بدکار۔ وعدے کو پورا کرنا خواہ جس سے وعدہ کیا گیا ہے وہ نیکوکار ہو یا بدکار اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا چاہے وہ خود نیکوکار ہوں یا بدکار (وسائل الشیعۃ، ج۲۱، ص۴۹۰؛ بحار الانوار، ج۷۱؛ ص۵۶)۔

ب: دوسری مشابہت:

ایک اور مشابہت بہت خاص طور پر قابل غور ہے، خدا کی ذات حیّ وقیّوم ہے ابدی و سرمدی۔ نہ اس کی ذات فانی ہے نہ اس کی حکومت منقطع ہونے والی ہے۔ اس کے برعکس حیات انسانی چند روزہ ہے۔ قیاس اس بات کا مقتضی تھا کہ جیسے ہی والدین کے حیات کا سلسلہ منقطع ہو اولاد کے سر سے ان کی اطاعت کا بار بھی اتر جائے۔ لیکن شریعت اسلام نے شاید یہ طے کر لیا تھا کہ ان کے ارباب مجازی یعنی والدین کو خدا کی ربوبیت کا کامل نمونہ بنا دے اور ان کے دنیا سے گذر جانے کے بعد بھی ان کے حقوق کی ذمہ داری اولاد پر باقی رہے۔ یعنی جب تک اولاد زندہ رہے والدین کے حقوق کی ادائیگی کرتی رہے۔

امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"إِنَّ الْعَبْدَ لَيَكُونُ بَارّاً بِوَالِدَيْهِ فِي حَيَاتِهِمَا ثُمَّ يَمُوتَانِ فَلَا يَقْضِي عَنْهُمَا دَيْنَهُمَا وَ لَا يَسْتَغْفِرُ لَهُمَا فَيَكْتُبُهُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَاقّاً وَ إِنَّهُ لَيَكُونُ عَاقّاً لَهُمَا فِي حَيَاتِهِمَا غَيْرَ بَارٍّ بِهِمَا فَإِذَا مَاتَا قَضَى دَيْنَهُمَا وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمَا فَيَكْتُبُهُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ بَارّاً"۔

"کبھی بندہ والدین کی زندگی میں ان کا مطیع و فرماں بردار رہتا ہے لیکن جب وہ مر جاتے ہیں تو نہ ان کا قرض ادا کرتا ہے نہ ان کے لئے استغفار کرتا ہے تو خدا اس کو عاق لکھ دیتا ہے۔ اور کبھی ان کی زندگی میں وہ ان کا نافرمان ہوتا ہے لیکن ان کے مر جانے پر ان کا قرض ادا کرتا ہے ان کے لئے استغفار کرتا ہے تو اللہ عزوجل اس کو مطیع و نیکوکار لکھ دیتا ہے" (بحار الانوار، ج۷۱؛ ص۵۹)۔

بنی سلمہ کے ایک شخص نے آنحضرتؐ سے پوچھا:

"هل بقي من بر أبويَّ شيء أبرهما به بعد موتهما؟"۔

"کیا میرے والدین کی وفات کے بعد بھی ان کا کوئی حق اطاعت باقی رہ گیا ہے جس سے میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں"؟

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"نعم الصلوة عليهما، و الاستغفار لهما، و إنفاذ عهد هما من بعد هما، و إكرام صديقهما . . . "۔

"ہاں! ان پر نماز پڑھنا، ان کی مغفرت کی دعا کرتے رہنا اور ان کے عہد کو پورا کرنا اور ان کے دوستوں کی تعظیم کرنا..." (تفسیر نور الثقلین، ج ۳؛ ص ۱۵۱)۔

ج: تیسری مشابہت

اسی روایت سے ایک اور مشابہت کا پتہ چلتا ہے۔ جس طرح اولیائے خدا کی تعظیم، حقوق خداوندی کا ایک بہت ہی اہم جزو ہے اسی طرح والدین کے دوستوں کی تعظیم و تکریم بھی ان کے واجب الادا حقوق میں شامل ہے۔

۸: ماں کے حقوق کی عظمت و برتری

یہاں تک تو ماں اور باپ دونوں کے حقوق کا عمومی حیثیت سے تذکرہ تھا۔ لیکن یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے کہ اولاد کی پیدائش اور تربیت میں ماں جتنی زحمتیں ہنس ہنس کر برداشت کر لیتی ہیں عطوفت پدری ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسلام دین فطرت ہے اس نے کہیں بھی فطری تقاضوں سے تغافل نہیں برتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی آیتوں میں خصوصیت سے صرف ماں کی زحمت کشی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْناً عَلىٰ وَهْنٍ وَ فِصالُهُ فِي عٰامَيْنِ"۔

"اس کی ماں نے دکھ پر دکھ سہہ کے اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کی دودھ بڑھائی کی" (سورہ لقمان، آیت ۱۴)۔

"حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهاً وَ وَضَعَتْهُ كُرْهاً وَ حَمْلُهُ وَ فِصالُهُ ثَلاٰثُونَ شَهْراً"۔

"اس کی ماں نے رنج ہی کی حالت میں اس کو پیٹ میں رکھا اور رنج ہی میں اس کو جنا۔ اور اس کے حمل اور دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہوئے" (سورہ احقاف، آیت ۱۵)۔

حکیم بن حزام نے رسالتمآبؐ سے دریافت کیا:

"يَارَسُولَ اللهِ مَنْ أَبَرُّ؟

اے اللہ کے رسولؐ! میں کس کے ساتھ نیکی کروں؟

آپؐ نے جواب دیا:

أُمَّكَ

اپنی ماں کے ساتھ نیکی کر۔

انہوں نے پوچھا:

ثُمَّ مَنْ؟

پھر وہی جواب ملا:

أُمَّکَ

(ماں کے ساتھ بھلائی کر)۔

انہوں نے پھر جرأت کی:

ثُمَّ مَنْ؟

اس کے بعد کون حسن سلوک کا مستحق ہے؟

پھر وہی جواب ملا:

أُمَّکَ

تیری ماں مستحق ہے۔

چوتھی مرتبہ پھر پوچھا:

ثُمَّ مَنْ؟

اب آنحضرتؐ نے فرمایا:

أَبَاکَ

اپنے باپ سے نیکی کے ساتھ پیش آ"۔ (الکافی، ج۲؛ص۱۵۹-۱۶۰ و ج۳؛ ص۴۰۹؛ بحارالانوار، ج۷۱، ص۴۹)۔

اس روایت کی وجہ سے علماء نے یہ کہا ہے کہ ماں کا حق باپ کے حق سے تین گنا زیادہ ہے۔ آنحضرتؐ نے مزید فرمایا ہے:

"الجنّة تحت أقدام الامّهات" (نہج الفصاحۃ (مجموعہ کلمات قصار حضرت رسولؐ)، ص۴۳۴)۔

جسے میر انیس مرحوم نے ایک مرثیہ میں یوں نظم فرمایا ہے:

"سنتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے"

۹۔ ایک ضروری تنبیہ

اسلام نے والدین کے حقوق و اختیارات کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ لیکن یہ اختیارات اپنے ساتھ کچھ پابندیاں بھی لاتے ہیں۔ ماں باپ کو ذمہ دار سرپرست بننا ہے نہ کہ مطلق العنان ڈکٹیٹر۔ اکثر کم ظرف افراد اپنے حقوق کا غلط استعمال کر کے خاندان و معاشرت کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔ انہیں سمجھنا چاہئے کہ ہر حق اپنے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی لاتا ہے۔ اسی لئے شارع اسلام نے ان حقوق و اختیارات کے عطا کرنے کے ساتھ ہی تنبیہ بھی کر دی ہے کہ:

"لعن الله الوالدين حملا اولاهما علىٰ عقوقهما"

"خدا ان والدین پر لعنت کرے جو اپنی اولاد کو اپنی نافرمانی پر مجبور کر دیں" (انوار الہدایہ)۔

اگر والدین خود اولاد کے حقوق کو نہ ادا کریں، ان کو صحیح تعلیم و تربیت سے ناآشنا رکھیں یا ان پر اتنا بوجھ لادنے کی کوشش کریں جس کو وہ برداشت نہ کر سکیں یا ضرورت سے زیادہ تشدد و تندخوئی سے پیش آئیں تو درحقیقت وہ خود ہی اولاد کو بغاوت پر آمادہ کر رہے ہیں، نافرمانی پر مجبور کر رہے ہیں۔ اور ایسی

صورت میں خاتم المرسلینؐ کی زبان سے نکلے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ ان کے لئے طوق لعنت بن جائیں گے۔ خداوند عالم ہم سب کو یہ توفیق کرامت فرمائے کہ جب ہم اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو ہمارے گردن دوسروں کے حقوق سے گراں بار نہ ہو۔

۱۰۔ قرآن اور انجیل

ریونڈ جی مارگولیوتھ (Rev.G.Margoliouth) نے یورنڈ جے۔ ایم۔ روڈول (Rev.G.M.Rodwell) کے انگریزی ترجمہ قرآن (The Koran) کے "تعارف" میں لکھا ہے:

"قرآن جن اخلاقی تعلیمات پر حاوی ہے ان کے نقائص اس وقت بہت صاف طور سے سامنے آجاتے ہیں ہیں جب ان کا تقابل اس بلند ترین اخلاقی میعار سے کیا جاتا ہے جس سے ہم آشنا ہیں (یعنی انجیل کے معیار سے)"

(The Koran (Rev. G.M. Rodwell), Introduce Tion, Rev. G. Margoliouth)

ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ قرآن اور قرآن کے لانے والے پیغمبرؐ نے والدین اور اولاد کے باہمی دینی اور اخلاقی حقوق و فرائض کے متعلق کیا بتایا اور سکھایا ہے۔ اب ذرا یہ بھی دیکھتے چلیں کہ اس کے بارے میں انجیل کا "بلند ترین اخلاقی معیار" کیا ہے؟۔ انجیل متی حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کہتی ہے:

"جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ ہی رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کو جواب میں کہا: کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا: "دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں" (انجیل متی، باب ۱۲، آیت ۴۶-۴۹)۔

سبحان اللہ! اپنے والدہ کے بارے میں گفتگو کرنے کا کتنا مہذب انداز اور دلنشین اخلاقی اسلوب ہے۔

ہم مسلمان جانتے ہیں حضرت عیسیٰؑ اپنی مقدس اور معصومہ ماں (علیہاالسلام) کے لئے یہ الفاظ ہر گز استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ہمارا یہ علم اور اعتقاد "انجیل" پر نہیں بلکہ قرآن پر مبنی ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔

"وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا"۔

"اللہ نے مجھے میری ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بنایا ہے اور مجھے تند خو اور بد بخت نہیں بنایا ہے" (سورہ مریم، آیت ۳۲)۔

اب اہل نظر خود فیصلہ کر لیں کہ کون سی کتاب "بلند ترین اخلاقی معیار" پیش کرتی ہے۔

ریورنڈ روڈول نے سورہ نساء کی آیت ۳۶:

"وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا"۔

''اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو'' (سورہ نساء، آیت ۳۶)۔

کے ذیل میں حاشیہ لکھا ہے کہ :

''مصریوں بلکہ عموماً تمام عربوں میں نافرمان بچہ شاذ و نادر ہی سننے میں آتا ہے۔ بچوں کو جب تک حکم نہ دیا جائے وہ نہ تو باپ کے سامنے بیٹھتے ہیں نہ کھاتے ہیں، نہ تمباکو نوشی کرتے ہیں۔ وہ اکثر کھانے کے وقت اور دوسرے مواقع پر اپنے باپ اور اس کے مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ کافی سن رسیدہ ہو جانے کے بعد بھی ان کے اس معمول میں فرق نہیں آتا'' (موجودہ مصر، لین، ج۱، ص۶۹۔ Lane, Modern Egypt)۔

ریورنڈ روڈول نے لین کے اس مشاہدہ کو اس آیت کا حاشیہ قرار دے کر صریحاً اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں میں والدین کا اس قدر ادب و لحاظ بہ راہ راست قرآنی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ اب ریورنڈر مارگولیوتھ سے اتنا کہنا پڑتا ہے کہ

بازار مصر میں چل یوسفؑ کا سامنا کر
کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن میں

(نوٹ: مابقیہ مطالب آئندہ شمارے میں شائع ہوں گے)

شخصیت و سیرت فاطمیؑ کے تین بنیادی پہلو

رہبر معظم آیت اللہ خامنہ ای کی نگاہ میں

- ترجمہ و ترتیب: مولانا سید تعلیم رضا جعفری صاحب۔
  - طالب علم جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم ایران

حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا)، کی شخصیت، سیرت، عظمت اور آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے انسانیت کے لیے بے مثال پیغامات اور سبق ملتے ہیں؛ آپؑ ایک ایسی شخصیت ہیں جسے رسول اعظم ﷺ، آئمہ معصومین ؑ اور اسلامی دنیا کے عظیم اور بزرگ علماء و دانشمندوں نے ایک مکمل رہنما اور بے مثال نمونہ و آئیڈیل کہا ہے۔ یقیناً شہزادی کائنات ؑ کی مختصر زندگی کے اس عظیم سمندر سے معنویت، معرفت اور جد و جہد کے گوہر تلاش کرنے اور مختلف ثمرات سے مستفیض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس عظیم خاتون کی شخصیت و سیرت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ اور اس سے معرفت حاصل کریں۔

اس تحریر میں حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای (دامت برکاتہ) کے بیانات کی روشنی میں شہزادی کونین، حضرت فاطمہ زہرا (علیہا السلام) کی شخصیت و سیرت کے تین اہم پہلوؤں کا ذکر کیا جا رہا ہے:

الف۔ معنوی و معرفتی پہلو؛ ب۔ خاندانی زندگی کا پہلو؛ ج۔ سماجی و سیاسی پہلو۔

الف: معنوی اور معرفتی پہلو

۱۔ انبیاءؑ کے برابر مقام

اگر حضرت فاطمہ زہراؑ کی شخصیت ہمارے سادہ ذہنوں اور تنگ نظر رکھنے والوں کے لئے واضح ہو جاتی، تو ہم بھی یقین کی منزل پر پہنچ جاتے کہ فاطمہ زہراؑ، تمام جہان کی خواتین کی سردار ہیں؛ ایک ایسی خاتون ہیں جنہوں نے اپنی کم عمری اور مختصر زندگی کے باوجود بلندترین معنوی، علمی اور معرفتی مقامات حاصل کئے، جو انبیاء اور اولیاء کے مقامات کے برابر ہیں۔ درحقیقت، فاطمہ زہراؑ ایک چمکتی ہوئی صبح ہیں جن کے دامن میں ولایت، امامت اور نبوت کا سورج چمکا ہے؛ آپؑ ایک بلند و بالا آسمان ہیں جن کی گود میں

ولایت کے چمکتے ہوئے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ تمام ائمہؑ اپنی اس عظیم ماں کے لیے ایسا احترام اور عقیدت رکھتے تھے کہ جو بہت کم کسی دوسری ہستی کے لئے دکھائی دیتا ہے۔ (بیان رہبر معظم، تاریخ: ۳۰/۰۷/۱۳۷۶)

۲۔ مثالی عبادت

حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کی عبادت ایک مثالی عبادت ہے۔ حضرت امام حسن مجتبیٰؑ بیان فرماتے ہیں:

"ایک شب جمعہ میری والدہ عبادت پروردگار میں مشغول ہوئیں اور صبح تک عبادت کرتی رہیں، یہاں تک کہ فجر کا وقت آگیا۔" یعنی میری والدہ رات کے آغاز سے لے کر صبح تک مسلسل عبادت، دعا اور التماس میں مشغول رہیں۔

حضرت امام حسنؑ مزید فرماتے ہیں "میں نے سنا کہ آپؑ مسلسل مومنین و مومنات کے لیے دعا فرما رہی تھیں؛ دوسرے لوگوں کے لیے دعا کر رہی تھیں؛ اسلامی دنیا کے عمومی مسائل کے لیے دعا کر رہی تھیں۔ جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا: "**یا أُمّاہ!** (اے مادر گرامی!) **"لم لا تدعین لِنَفْسِکِ کما تدعین لِغَیرِکِ؟"**، آپ خود کے لیے کیوں دعا نہیں مانگتی ہیں اور صرف دوسروں کے لیے دعا مانگتی ہیں؟ آپؑ نے پوری رات دعا کی، مگر سب کچھ دوسروں کے لیے طلب فرمایا؟۔

اس پر آپؑ نے جواب دیا: **"یا بنیّ! الجارُ ثمّ الدار!"**؛ "اے میرے بیٹے! پہلے پڑوسی، پھر گھر والے!"۔ یہی آپ کی روحانیت کا عظیم و بلند مقام ہے!

حسن بصری، جو اسلامی دنیا کا مشہور عابد و زاہد فرد بیان کیا جاتا ہے، وہ نقل کرتا ہے کہ:

"نبی کی بیٹی (فاطمہ زہراؑ) اتنی عبادت کرتی تھیں اور محراب عبادت میں اتنی دیر تک کھڑی رہتی تھیں کہ آپ کے قدموں میں ورم آجاتا تھا!"۔ (بیان رہبر معظم، تاریخ: ۲۵/۰۹/۱۳۷۱)

۳۔ امیر المؤمنینؑ کے ہم پایہ

فاطمہ زہراؑ ظاہری اعتبار سے ایک انسان، ایک خاتون، بلکہ ایک جوان خاتون ہیں؛ لیکن حقیقت کے اعتبار سے ایک عظیم حقیقت، ایک چمکتا ہوا الٰہی نور، ایک نیک کنیز خدا اور ایک نمایاں و برگزیدہ انسان ہیں۔ آپ وہی ہیں جن کے بارے میں رسول اکرمؐ نے امیر المؤمنینؑ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

«یا علی... انت قائد المؤمنین إلی الجنّة... و فاطمة قد أقبلت یوم القیامة... تقود مؤمنات أمتی إلی الجنّة»؛ "اے علیؑ! قیامت کے دن آپ، مومن

مردوں کو جنت کی طرف لے جائیں گے اور فاطمہ زہراؑ، مومنہ خواتین کو جنت کی راہ دکھائیں گی"۔

اس طرح سے فاطمہ زہراؑ، امیر المؤمنینؑ کے برابر، ہم پایہ اور ہمسنگ ہیں۔

آپ ایسی خاتون ہیں کہ جب محرابِ عبادت میں کھڑی ہوتی تھیں تو ہزاروں مقرب فرشتے آپ کی طرف متوجہ ہوتے، آپ کو سلام کرتے، مبارکباد دیتے اور وہی کلام پیش کرتے جو پہلے مریم طاہرہؑ سے کہتے تھے:

«یا فاطمة! إنّ الله اصطفاک و طهّرک و اصطفاک علیٰ نساء العالمین».

"اے فاطمہؑ! بے شک اللہ نے آپ کو منتخب فرمایا ہے، آپ کو پاک کیا ہے اور آپ کو تمام جہان کی خواتین پر فضیلت دی ہے"۔

یہ حضرت فاطمہ زہراؑ کا عظیم معنوی مقام ہے۔

آپؑ ایک ایسی خاتون ہیں—اور وہ بھی جوانی کی عمر میں—جو معنوی مقام کے اعتبار سے ایسی بلندیوں پر پہنچیں کہ بعض روایات کے مطابق فرشتے آپ سے بات کرتے تھے اور آپ کو حقائقِ غیبیہ سے آگاہ کرتے تھے۔ آپ "مُحَدَّثَہ" ہیں، یعنی وہ شخصیت جس سے فرشتے کلام کرتے ہیں۔ باتیں کرتے تھے۔ آپ کا یہ معنوی مقام، وسیع میدان اور عظیم بلندی، عالم خلقت کی تمام خواتین کے مقابلے میں ہے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ، معنویت کی عظیم بلندی پر کھڑی ہیں اور تمام دنیا کی خواتین کو خطاب کرتے ہوئے انہیں اس راہ پر چلنے کی دعوت دیتی ہیں۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۶/۱۰/۱۳۶۸)۔

۴۔ پیغمبرؐ اور امیر المؤمنینؑ کے مانند

ہماری روایات و احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے ذمّے صرف نبوت اور امامت کی ذمّہ داری نہیں تھی؛ ورنہ معنوی اعتبار سے پیغمبر اکرمؐ اور امیر المؤمنینؑ سے آپ کی ذات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک اٹھارہ سالہ خاتون—جو فاطمہ زہراؑ کی زیادہ سے زیادہ عمر تھی—معنوی، عرفانی بلندیوں، حکمت، انداز بیان، سیاسی و سماجی مسائل کے گہرے تجزیے، مستقبل بینی، اور اپنے دور کے سب سے بڑے مسائل سے نپٹنے کی صلاحیت کی منزلوں پر فائز تھیں۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۰۸/۰۹/۱۳۷۲)

۵۔ پاکیزگی کا مظہر

حضرت امام رضاؑ کی زیارت میں صلوات کے وقت جب حضرت فاطمہ زہراؑ کا ذکر آتا ہے، تو یوں ذکر ہوتا ہے کہ:

«اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَی فاطِمَةَ بِنتِ نَبِیِّک»

یہ ایک خصوصیت ہے۔ یقیناً یہ خصوصیت بہت اہم ہے، البتہ یہ ہر کسی کے لیے قابلِ پیروی نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی پیغمبرؐ کی بیٹی نہیں بن سکتی۔ لیکن یہاں

پیغمبرؐ کی بیٹی سے منسوب کر کے ذکر کیا جانا، آپ کے لئے ایک بلند مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا جاتا ہے:

«وَزَوجَةِوَلِيِک»

یہ دوسرا اعزاز ہے۔ یہ بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں کہ وہ اللہ کے ولی کی زوجہ بن سکے؛ لیکن یہ فقرہ بھی اس خاتون کی عظیم شان و منزلت اور آپ کی بلندی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

اس کے بعد آپ کے صفات کا بیان ہوتا ہے کہ: «اَلطُّهرَةِ الطّاهِرَةِ المُطَهَّرَةِ التَّقيَةِ النَّقيَةِ الرَّضيَةِالزَّکيَة»

یہ تمام صفات قابل عمل ہیں۔ خصوصاً "طہارت" جس کو تین الفاظ ـــ«طُهرَة»، «طاهِرَة»، اور «مُطَهَّرَة»ـــ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، البتہ تینوں کا تعلق پاکیزگی اور طہارت سے ہے؛ یعنی روح کی طہارت، دل کی طہارت، ذہن کی طہارت، عزت و وقار کی طہارت، اور پوری زندگی کی طہارت۔

یہ صفات ہمارے لیے ایک سبق ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے آپ کو پاکیزہ کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ بغیر باطنی طہارت کے کسی بھی معنوی مقام تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، اور نہ ہی ان عظیم ہستیوں کی ولایت کے دائرے تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ باطنی طہارت ضروری ہے۔ باطن کی طہارت تقویٰ اور پرہیزگاری کے لئے ضروری ہے۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۱۳۹۵/۰۱/۱۱)۔

۶۔ الٰہی معارف کی اعلیٰ ترین بلندی پر مشتمل خطبہ

اس عظیم خاتون کی ظاہری زندگی میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک علم، حکمت اور معرفت ہے۔ یہ بات خاص طور پر آپ کے مشہور خطبۂ فَدَکیہ میں نمایاں ہے، جسے شیعہ بھی نقل کرتے ہیں اور اہل سنت میں سے بھی بعض نے اس کے بعض اجزاء کو اور بعض نے پورے خطبے کو نقل کیا ہے۔ جب آپ اس خطبے کے ابتدائی جملات، حمد و ثنائے پروردگار اور اس کے آغاز کو دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ حکمت و معرفت کا ایک ایسا سیلاب اس خاتون کی زبانِ مبارک سے جاری ہوا ہے جو آج تک، الحمد للہ۔ ہمارے لیے محفوظ ہے۔

یاد رکھیں کہ یہ خطبہ کسی تعلیمی یا علمی جلسے کے لیے نہیں تھا، نہ ہی اس کا موضوع علم و معرفت کا اظہار تھا؛ بلکہ یہ ایک سیاسی مناظرہ تھا۔ پھر بھی، اس مبارک خطبے میں الٰہی اور اسلامی معارف کو، عالی ترین سطح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو ہمارے لئے قابل فہم ہے۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۱۳۸۹/۰۳/۱۳)

(حضرت فاطمہ زہراؑ)، علمی لحاظ سے ایک عظیم عالمہ تھیں۔ آپ کا وہ خطبہ جو آپ نے مدینہ کی مسجد

میں پیغمبرؐ کی وفات کے بعد ارشاد فرمایا تھا، علامہ مجلسی اس خطبے کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ : «فصاحت و بلاغت کے میدان کے بزرگ اور علماء بیٹھیں اور اس خطبہ کے الفاظ و عبارات کی تفسیر کریں»۔ اس قدر یہ خطبہ گہرائی اور معنویت سے بھرا ہوا ہے... شاید آپ نے ایک گھنٹے کے اندر انتہائی خوبصورت الفاظ اور منتخب ترین معانی کے ساتھ اپنی باتوں کو بیان کر دیا۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۵/۰۹/۱۳۷۱)۔

۷۔ عظیم ہستیوں کی مشکلات میں مدد اور فداکاری

اس عظمت کو ملاحظہ کریں کہ ایک چھوٹی بچی، جب انسانیت کے سب سے عظیم ترین ہستیوں پر سخت ترین آزمائشوں کا وقت آتا ہے، تو فوراً ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑتی ہے! یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ وہی فداکاری کا جذبہ ہے جو جوانی کے دور میں—پندرہ، سولہ، اٹھارہ سال کی عمر تک، اور آخر کار اپنی مختصر زندگی کے آخری لمحے تک—اس قدر معنوی مقامات کا تجربہ کرتی ہیں اور ایسے عظیم کام انجام دیتا ہیں اور تشیّع و اسلام کی تاریخ پر ایسا گہرا اثر چھوڑتی ہیں جس کی وجہ زہراء اطہرؑ، رہتی دنیا تک چمکتے ہوئے سورج کے مانند رہیں گی۔ یہ سارے اثرات ایک جوان خاتون کی زندگی، شخصیت اور خصوصیات سے ظاہر ہوئے ہیں۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۶/۰۶/۱۳۷۶)

۸۔ ایثار، اللہ کی اطاعت اور عبادت

ہمیں چاہیے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے راستے پر چلیں۔ ہمیں بھی قربانی دینی چاہیے، ایثار کرنا چاہیے، اللہ کی اطاعت کرنا چاہیے، اور عبادت کرنا چاہیے۔ کیا ہم نہیں کہتے ہیں کہ «حتّی تورّم قدماها» یعنی فاطمہ زہراؑ اس قدر محراب عبادت میں کھڑی رہتی تھیں کہ آپ کے قدموں میں ورم آجاتا تھا۔ تو ہمیں محراب عبادت میں حاضر ہونا چاہئے۔ کچھ حد تک تو عبادت کرنا چاہئے، ہمیں بھی اللہ کا ذکر کرنا چاہیے، اور ہمیں بھی اپنے دلوں میں روز بروز الٰہی محبت کو بڑھانا چاہیے۔

کیا ہم بیان نہیں کرتے ہیں کہ آپؑ اپنی کمزوری کے باوجود مسجد تک گئیں تاکہ حق کو قائم کر سکیں؟ تو ہمیں بھی ہر حال میں کوشش کرنی چاہیے کہ حق کو قائم کریں۔ ہمیں بھی کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔

کیا ہم نہیں کہتے ہیں آپ اکیلی ہی اپنے زمانے کے پورے معاشرے کے مقابل کھڑی ہوئیں؟ (تو ہمیں بھی ولایت کے دفاع میں اپنے اعتبار سے قیام کرنا چاہئے)۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۰۵/۱۰/۱۳۷۰)۔

ب۔ خاندانی زندگی کا پہلو

۱۔ سادہ مہر اور جہیز

ہجرتِ نبویؐ کے بعد، جب فاطمہ زہراؑ، جب بالغ ہوئیں اور حضرت علی بن ابی طالبؑ سے آپ کا نکاح

ہوا تو آپ کا مہر اور جہیز وہی تھا جس کے بارے میں شاید آپ سب جانتے ہیں کہ کس قدر معمولی اور فقیرانہ تھا۔ وہ بھی اسلامی دنیا کے سب سے بلند مرتبہ شخصیت (یعنی رسول خداؐ) کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی اور کس قدر سادگی اور غربت کے انداز میں یہ شادی ہوئی۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۱۳۷۱/۰۹/۲۵)

۲۔ خانہ داری اور شوہر داری کی بہترین مثالی

کبھی کبھار انسان یہ سمجھتا ہے کہ "شوہر داری" کا مطلب صرف یہ ہے کہ گھر میں کھانا پکانا، کمرہ صاف ستھرا رکھنا، بستر بچھانا، اور پرانے زمانے کی طرح چٹائی بچھا دینا تاکہ شوہر دفتر یا دکان سے آکر آرام کر سکے! لیکن شوہر داری صرف یہی نہیں ہے۔ آپ دیکھیں کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی شوہر داری جو ایک عظیم نمونہ اور بہترین مثال ہے وہ کیسی تھی۔

جب تک دس سال مدینہ میں رسول اللہؐ کی موجودگی رہی، تب تک تقریباً نو سال تک حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت امیر المؤمنینؑ، شوہر اور بیوی کے طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ اس عرصے میں تقریباً ساٹھ چھوٹی بڑی جنگیں ہوئیں— جس میں اکثر جنگوں میں امیر المؤمنینؑ بھی شریک تھے۔

اب آپ غور کریں کہ فاطمہ زہراؑ ایک ایسی خاتون ہیں جو گھر میں رہتی ہیں، جبکہ آپ کے شوہر مسلسل جنگ کے میدان میں ہیں—اور اگر امام علیؑ جنگ کے میدان میں جائیں تو جنگ میں کامیابی بھی نہیں ملتی، یعنی جنگ آپ پر ہی منحصر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی حالت بھی کچھ خاص نہیں تھی۔ جیسا کہ ہم نے سنا ہے کہ «وَ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا، إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ» یعنی واقعاً آپ کی زندگی محض فقیرانہ تھی— حالانکہ آپؑ نہ صرف یہ کہ ایک اسلامی رہنما کی بیٹی تھیں، بلکہ پیغمبر اکرمؐ بیٹی بھی تھیں، یہ چیز ایک گہری ذمہ داری کا احساس کرواتی ہے۔

آپ سوچیں کہ ایسے حالات میں شوہر کو جنگ کے لیے تیار کرنے، ان کے دل کو گھر والوں اور زندگی کی پریشانیوں سے دور رکھنے، انہیں حوصلہ دینے، اور بچوں کو اس طرح پالنے کے لئے کتنی مضبوطی اور روحانی استحکام کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب آپ کہہ سکتے ہیں حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ تو معصوم امام تھے اور ان دونوں حضرات میں امامت کی فطرت تھی؛ لیکن حضرت زینبؑ تو امام نہیں تھیں—انہیں بھی حضرت فاطمہ زہراؑ نے اسی نو سالہ عرصے میں پالا تھا۔ اور پھر رسول اللہؐ کی وفات کے بعد تو حضرت فاطمہؑ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہیں۔

آپؑ نے اس طرح کی خانہ داری اور اس طرح سے شوہر داری کی اور اسی طرح خاتونِ خانہ کی حیثیت

کا کام کیا کہ آپ اپنے خاندان کے مرکز بن گئیں اور تاریخ میں ایک لازوال مثال قائم کیں۔ کیا یہ سب باتیں آج کی جوان خاتون، خانہ دار خاتون یا خانہ داری کے دائرے میں داخل ہونے والی خاتون کے لئے ایک نمونہ کامل نہیں ہو سکتی؟۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۰۷/۰۲/۱۳۷۷)

۳۔ بچوں کی عظیم تربیت

حضرت امام رضاؑ کی زیارت میں آیا ہے کہ:

«وَ أُمَّ السِّبْطَيْنِ الْحَسَنِ وَ الْحُسَيْنِ، سَيِّدَيْ شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ...» یعنی وہ ماں جن کے دو بیٹے— امام حسن اور امام حسینؑ—جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔ ان دونوں عظیم ہستیوں کی ماں یہی بزرگ خاتون ہیں؛ اور یہی پاکیزہ دامن مادری تھا جس نے انہیں پالا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمارے لیے ایک نمونہ اور آئیڈیل بن سکتی ہے۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۱۱/۰۱/۱۳۹۵)

۴۔ شوہر کی خشنودی کا خیال

امیر المؤمنینؑ نے حضرت فاطمہ زہراؑ کے بارے میں فرمایا:

«ما أَغْضَبَتْنی وَلا خَرَجَتْ مِنْ أَمْری» یعنی "اس خاتون نے مجھے کبھی بھی غصہ نہیں دلایا اور میری کسی بات کی مخالفت نہیں کی"۔

حضرت فاطمہ زہراؑ—جو عظمت اور جلالت کے بلند مقام پر تھیں—اس کے باوجود گھر کے اندر ایک شوہر کی بیوی تھیں اور بالکل ویسے ہی زندگی گزاری جیسے اسلام چاہتا ہے۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۵/۰۹/۱۳۷۱)۔

۵۔ الٰہی انتخاب پر خوشی و رضامندی

حضرت فاطمہ زہراؑ نے شادی کے خواہشمندوں میں—جن میں دولت مند، باوقار اور نامور لوگ بھی شامل تھے—صرف اس پاک دل جوان کو منتخب کیا جو ہمیشہ خدا کی راہ میں جدوجہد کرتا رہا اور جنگوں کے میدانوں میں موجود رہتا تھا۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے!

فاطمہ زہراؑ، پیغمبرِ اکرمؐ جو عالم اسلام اور وقت کا طاقتور حاکم تھے، ان کی بیٹی تھیں اور آپ سے شادی کے لئے بہت سے خواہشمند تھے جو خود مال و دولت اور شوہرت والے تھے۔

لیکن اللہ نے ان سب میں سے صرف حضرت علیؑ کو فاطمہ زہراؑ کے لیے منتخب فرمایا تھا اور فاطمہؑ نے اس الٰہی انتخاب پر خوشی اور رضامندی کا اظہار کیا۔ پھر آپؑ نے امیر المؤمنینؑ کے ساتھ ایسی زندگی گزاری کہ آپ ہر لحاظ سے ان سے راضی تھے۔

آپؑ کی زندگی کے آخری دنوں میں، امیر المؤمنینؑ سے جن الفاظ کا اظہار فرمایا، وہ اسی حقیقت کی گواہی

دیتے ہیں؛ آپؑ نے ہر موڑ پر صبر کیا، اپنے بچوں کی اعلیٰ تربیت کی، ولایت کے حق کے لیے جان فشانی سے دفاع کیا، اس راستے میں سخت ترین تکالیف اور ستم برداشت کیے، اور آخر کار اُس عظیم شہادت کو کھلے دل و کھلی آغوش سے قبول کر لیا۔ یہی ہیں فاطمہ زہراؑ۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۰۳/۰۹/۱۳۷۳)۔

ج۔ سماجی اور سیاسی پہلو

ا۔ گھریلو اور سماجی زندگی کا بہترین امتزاج

اس عظیم خاتون (حضرت فاطمہ زہراؑ) کی معمولی زندگی میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ آپؑ نے ایک طرف، ایک مسلمان خاتون کی حیثیت سے شوہر اور بچوں کے ساتھ اپنے بہترین سلوک، گھر میں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی—اور دوسری طرف ایک غیور، نڈر اور نہ تھکنے والی مجاہدہ کی حیثیت سے رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد پیش آنے والے اہم سیاسی واقعات کے بعد مسجد میں جا کر تقریر کرنے، موقف اختیار کرنے، حق کا دفاع کرنے، تقریر کرنے اور ہر لحاظ سے ایک مکمل جہاد کرنے والی، نہ تھکنے والی، محنت کش اور مشکلات برداشت کرنے والی شخصیت کا مظاہرہ کیا—اور آپؑ نے ان دونوں پہلوؤں کو ایک ساتھ جمع کیا۔

اسی طرح آپؑ ایک عابدہ اور نماز گزار خاتون بھی تھیں، آپ اندھیری راتوں میں اللہ کے لیے قیام کرتی تھیں، اپنے پروردگار کے سامنے خضوع و خشوع کے ساتھ سجدوں میں رہتی تھیں اور یہ جوان خاتون محرابِ عبادت میں قدیم اولیاء کی طرح اللہ سے راز و نیاز اور عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔

آپؑ نے ان تینوں پہلوؤں—خاندانی ذمہ داری، سیاسی جہاد اور معنوی عبادت— کو ایک ساتھ جمع کر لیا تھا۔ یہی حضرت فاطمہ زہراؑ کی زندگی کا درخشاں پہلو ہے۔ آپؑ نے ان تینوں جہات کو الگ الگ نہیں رکھا۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص عبادت میں مشغول ہو، وہ صرف ایک عابد، متضرّع، دعا گو اور ذکر الٰہی کا عادی ہوتا ہے اور سیاست سے کنارہ کش رہتا ہے۔ اور کچھ یہ خیال رکھتے ہیں کہ جو شخص سیاست میں فعال ہو—خواہ وہ عورت ہو یا مرد— اور جہاد فی سبیل اللہ کے میدان میں موجود ہو تو اگر وہ عورت ہے تو وہ گھریلو فرائض، ماں اور بیوی کی ذمہ داریوں کو انجام نہیں دے سکتی اور اگر مرد ہے تو وہ گھر، دکان اور عام زندگی کے کاموں میں مصروف نہیں رہ سکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں ایک دوسرے کے منافی ہیں۔

لیکن اسلامی نقطہ نظر سے یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے کے خلاف یا متضاد نہیں ہیں؛ بلکہ کامل انسان کی شخصیت میں یہ ایک دوسرے کی مددگار ہوتی ہیں۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۲/۰۹/۱۳۶۸)

۲۔ پیغمبرؐ کی پرستاری اور غمگساری

ایک ایسی بیٹی جو مکہ میں پیغمبرؐ کی سخت ترین جہادی کشمکش کے حالات کے وقت پیدا ہوئیں وہ "شعب ابی طالبؑ" کے دوران اپنے والد کی ہمدرد اور ساتھی بنیں۔ ایسی بیٹی جو تقریباً سات، آٹھ یا دو تین سال کی تھیں تو اس وقت جب خدیجہ الکبریٰؑ اور ابوطالبؑ دونوں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اُن مشکل حالات کو برداشت کیا۔

پیغمبر اکرمؐ ان دنوں میں تنہا تھے، کوئی آپ کا ہمدرد نہ تھا پھر بھی سب ان کی پناہ میں رہتے تھے۔ لیکن کون تھا جو ان کے چہرے سے غم کا غبار مٹاتا؟ پہلے خدیجہؑ تھیں، لیکن اب وہ نہیں رہیں۔ ابوطالبؑ تھے، جو اب نہیں رہے۔ ایسے ہی مشکل حالات میں—جس میں تین سالہ "شعب ابی طالبؑ" کی بھوک، پیاس، سردی اور گرمی کے سخت ترین دنوں میں پیغمبرؐ اور چند گنے چُنے مسلمانوں کو وادی میں زبردستی تبعید کا سامنا تھا—یہی بیٹی پیغمبرؐ کے لیے فرشتۂ رحمت کی طرح تھیں؛ اپنے باپ کے لیے ماں کی طرح تھیں؛ اور اُس عظیم انسان کے لیے ایک بڑی پرستار کی طرح تمام مشکلات کو برداشت کیں۔

آپؑ پیغمبر کی ہمدرد بنیں، ان کی ذمہ داریوں کو اٹھایا، اللہ کی عبادت کی، اپنے ایمان کو مضبوط کیا، خود کو سجایا، اور الٰہی معرفت و نور کا راستہ اپنے دل میں کھول لیا۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو انسان کو کمال تک پہنچاتی ہیں۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۵/۰۹/۱۳۷۱)۔

۳۔ راہ خدا میں مختلف سختیوں پر صبر و تحمل

حضرت فاطمہ زہراؑ کی شخصیت، سیاسی، سماجی اور جہادی پہلوؤں کے اعتبار سے ایک نمایاں اور برجستہ شخصیت ہیں، جس سے دنیا کی تمام مبارز، انقلابی، سیاسی اور نمایاں خواتین آپ کی مختصر مگر پُر معنی زندگی سے سبق لے سکتی ہیں۔

وہ خاتون جو انقلاب کے گھر میں پیدا ہوئیں اور اپنی پوری بچپن کی زندگی اُس باپ کی گود میں گزاری جو ایک عظیم، عالمی اور ناقابلِ فراموش جہاد میں مصروف تھے۔

وہ خاتون جس نے بچپن ہی میں مکہ کے جہادی دور کی سختیاں برداشت کیں اور "شعب ابی طالبؑ" میں لے جائی گئیں، بھوک، مشکلات، خوف اور مکہ کے جہادی دور کی ہر قسم کی سختیوں کا تجربہ کیا۔ پھر جب مدینہ ہجرت کی تو اُنہوں نے ایسے مرد سے نکاح کیا جس کی پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ پر منحصر تھی۔ فاطمہ زہراؑ اور امیر المؤمنینؑ کی تقریباً گیارہ سالہ اس مشترکہ زندگی میں ایسا کوئی سال—بلکہ کوئی آدھا سال بھی—نہیں گزرا جب یہ شوہر، جہاد فی سبیل اللہ کے لیے آمادہ اور جنگ کے میدان میں نہ گیا ہو۔ اور یہ

عظیم اور فداکار خاتون، ایک مجاہد، جنگجو اور میدانِ جنگ کے ہمیشہ موجود رہنے والے سربار اور سردار کی ہمسری کے لائق تھیں۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۶/۱۰/۱۳۶۸)۔

۴۔ ایک مکمل رہنما

حضرت فاطمہ زہراؑ ایک مکمل اور حقیقی رہنما کے طور پر نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ امام خمینی نے فرمایا: "اگر فاطمہ زہراؑ مرد ہوتیں، تو پیغمبر ہوتیں۔"

یہ بہت قابل تعجب اور بہت بڑی بات ہے—— ایسی بات جو صرف ایسے شخص کی زبان سے سنی جاسکتی ہے جو خود عالم، فقیہ اور عارف ہو۔ عام انسان ایسی بات نہیں کہہ سکتا، لیکن اُن بزرگ نے یہی کہا ہے۔

یعنی فاطمہ زہراؑ واقعی معنی میں ایک مکمل رہنما ہیں—— بالکل ویسے ہی جیسے کوئی پیغمبر یا پوری انسانیت کا ہادی ہوتا ہے۔ اس حد تک اور اتنی بلند عظمت تک زہرائے طاہرہؑ—— وہ بھی ایک جوان بیٹی—— پہنچی ہیں۔ یہی واقعی اسلامی خاتون ہیں۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۹/۱۲/۱۳۹۵)۔

۵۔ امامت وولایت کے دفاع میں جہاد

حضرت حضرت فاطمہ زہراؑ کا مختلف میدانوں میں جہاد اور کوشش کرنا، ایک مثالی جہاد ہے؛ آپ نے اسلام کے دفاع میں، امامت و ولایت کے دفاع میں، پیغمبرؐ کی حمایت میں، اور اسلام کے سب سے بڑے سردار—— یعنی امیر المؤمنینؑ، جو آپ کے شوہر تھے—— ان کی حفاظت میں میں جہاد کیا ہے۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۵/۰۹/۱۳۷۱)۔

اگر ہم پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد مدینہ کی نہایت حساس صورتحال کو سمجھیں اور مسئلے کو صحیح طرح سے جانیں تو ہمیں احساس ہوگا کہ فاطمہ زہراؑ نے کتنا عظیم کام انجام دیا ہے۔

حالات انتہائی مشکل تھے—— یہاں تک کہ خاص لوگوں کے لیے بھی سمجھنا مشکل تھا۔ پیغمبرؐ کے تمام صحابہ میں سے صرف دس، بارہ افراد ہی مسجد میں حاضر ہوئے اور امیر المؤمنینؑ کے حق اور آپؑ کی عظمت کے دفاع کے لیے کھڑے ہوئے۔

اس وقت اتنے سارے صحابہ، بزرگ، قرآن خوان، اور بدر و حنین کے مجاہدین موجود تھے—— اور ایسا بھی نہیں تھا کہ سب کے سب عناد رکھتے تھے؛ نہیں، مسئلہ اتنا واضح نہیں تھا کہ خاص لوگ بھی اسے صحیح طرح سے سمجھ پائیں۔

جناب عمّار دفاع کررہے تھے، ابوذر دفاع کررہے تھے، زبیر (ابتدائی دور میں) دفاع کرنے والوں میں تھے—— یہی وہ لوگ تھے جو منبر کے پاس کھڑے ہوئے اور انہوں نے امیر المؤمنینؑ کے حق کا دفاع کیا۔ تاریخ میں صرف دس بارہ افراد کے نام

درج ہیں، اور زبیر بھی انہی میں شامل تھے — اس بات کو ذہن نشین رکھیں۔

ایسے حالات، ایسے مشکل وقت میں پیغمبرؐ کی بیٹی مسجد میں آتی ہیں اور اپنا وہ عظیم الشان خطبہ — وہ حیرت انگیز بیان — پیش کرتی ہیں جس کے ذریعہ آپ نے حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا۔

یا پھر وہ خطبہ جو آپ نے مدینہ کی خواتین کے سامنے بیماری کے بستر پر ارشاد فرمایا — جو تاریخ میں محفوظ ہے اور مکمل طور پر موجود ہے۔

یہ معنوی (پوشیدہ) پہلو کی باتیں نہیں ہیں؛ بلکہ یہ وہی پہلو ہیں جو ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ عام عقلی نگاہ سے بھی اسے سمجھا جا سکتا ہے، لیکن پھر بھی یہ پہلو اس قدر عظمت کا حامل ہے جس کی پیائش ممکن نہیں — یعنی آپ کی قربانی کا کسی دوسری قربانی سے موازنہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۹/۱۲/۱۳۹۵)۔

۶۔ لوگوں کے لئے مرکزِ رجوع

حضرت فاطمہ زہراؑ کی زندگی تمام جہات سے ایک ایسی زندگی ہے جو محنت، کوشش، روحانی ترقی اور کمال کی طرف گامزن ہے۔ آپ کے جوان شوہر ہمیشہ جنگ کے میدانوں میں موجود رہتے ہیں، لیکن مشکل حالاتِ زندگی کے باوجود، فاطمہ زہراؑ، لوگوں اور مسلمانوں کے لیے ایک "مرکزِ رجوع" کی طرح ہیں۔ آپ حلال مشکلات پیغمبرؐ کی بیٹی ہیں، اور ایسے ہی حالات میں آپ نے اپنی زندگی کو مکمل عزت و وقار کے ساتھ آگے بڑھایا۔

آپ نے امام حسنؑ، حسینؑ اور زینبؑ جیسی اولاد کی پرورش فرمائی۔ علیؑ جیسے شوہر کی خدمت کی۔ اس باپ کی خشنودی اور رضایت کو حاصل کیا جو خود اللہ کا عظیم پیغمبرؐ ہے۔

جب فتوحات کے دروازے کھلتے تھے اور غنائم کی بارش ہوتی تھی تب بھی پیغمبرؐ کی اس بیٹی نے دنیا کی لذتوں، تقریبات، زیورات اور ان چیزوں کی طرف جن کی طرف ذرا برابر توجہ نہیں کی جن کی طرف عام جوان خواتین اور عورتوں دل سے مائل ہوتی ہیں۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۵/۰۹/۱۳۷۱)۔

۷۔ ضرورتمندوں پر احسان

جب پیغمبر اکرمؐ نے ایک بوڑھے مستحق شخص کو حضرت امیر المؤمنینؑ کے دروازے پر بھیجا اور فرمایا: «جاؤ، اپنی حاجت ان سے مانگو»، تو فاطمہ زہراؑ نے اس چمڑے کا بچھونا جن پر حسنینؑ سوتے تھے اور جو ان کا واحد بستر تھا — اور گھر میں اس کے سوا کچھ نہ تھا — اسی کو آنے والے سائل کے حوالے کر دیا اور فرمایا: «لے جا کر اسے بیچ دینا، اور اس کی قیمت سے اپنا کام چلا لینا»۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۲۵/۰۹/۱۳۷۱)

۸۔ معاشرے میں فعال کردار

مسلم خواتین کو چاہیے کہ اپنی ذاتی، سماجی اور خاندانی زندگی میں حضرت فاطمہ زہراؑ کی زندگی کو اپنا نمونہ عمل اور رہنما بنائیں—چاہے وہ سمجھداری، دانشمندی، عقلمندی، معرفت کے پہلو ہوں، یا عبادت، جہاد، بڑے سماجی فیصلوں کے میدان میں موجودگی، خانہ داری، شوہر داری اور نیک فرزندوں کی تربیت کے پہلو ہوں۔ کیونکہ اس عظیم اسلامی خاتون نے اپنی مختصر سی زندگی میں یہ ثابت کر دیا کہ ایک مسلم خاتون سیاست کے میدان، کاروبار و محنت کے عرصے اور معاشرے میں فعال کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ علم حاصل کر سکتی ہیں، عبادت کر سکتی ہے، اچھی بیوی بن سکتی ہے، اور نیک فرزندوں کی پرورش کر سکتی ہے۔ اور اس طرح حضرت فاطمہ زہراؑ کی پیروی کر سکتی ہے اور اللہ کے عظیم الشان پیغمبرؐ کی محبوب بیٹی کو اپنا الگو قرار دے سکتی ہے۔ (بیان رہبر معظم۔ تاریخ: ۱۷/۰۹/۱۳۷۲)۔

تسبیح حضرت فاطمہ زہرا (علیہا السلام)

▪ تحریر: مولانا سید معظم حسین زیدی۔
○ طالب علم جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم ایران

تمہید

یوں تو کائنات کی ہر شے خداوند عالم کی تسبیح میں مصروف ہے مگر اس اشرف مخلوق انسان کو خداوند عالم نے یہ خاص شرف بخشا ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار اور مخصوص ادراک و شعور کے ساتھ خداوند عالم کی تسبیح کرتے ہوئے، کائنات کے اس نظام کے ہم آہنگ ہوتے ہوئے، خود کو غافلین کی فہرست سے نکال کر ذاکرین کے زمرہ میں داخل کرلے یا پھر اپنی بے توجہی، عدم علم و آگہی، بے بصیرتی، پیروی ہوا و ہوس اور مادیات میں شدید انہماک اور مصروفیت کی بنیاد پر غفلتوں کا شکار ہو کر اسفل سافلین کا مصداق بن جائے. مقالہ حاضر میں آیات قران و احادیث معصومین علیہم السلام کی نظر میں تسبیح الہی، خاص کر تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کی عظمت، کیفیت اور آثار و برکات پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی۔

تسبیح الٰہی اور قرآن مجید

لفظ تسبیح اور اس کے مشتقات کا تذکرہ قرآن مجید میں تقریباً ۹۰ مرتبہ ہوا ہے، جن میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ، سبحان ہے (محمد فؤاد عبد الباقی، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم؛ برنامۂ جامع التفاسیر مرکز تحقیقات اسلامی نور)۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کے سات سورے ایسے ہیں جن کا آغاز ہی لفظ تسبیح اور اس کے مشتقات سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ مُسَبِّحات کے نام سے مشہور ہوگئے ہیں؛ سورہ صف، سورہ اعلی، سورہ حدید، سورہ جمعہ، سورہ تغابن، سورہ حشر اور سورہ اسراء؛ قرآن مجید کے وہ سورے ہیں جنہیں مُسَبِّحات کہا جاتا ہے.

لفظ تسبیح کا معنی اور مفہوم

تسبیح کے معنی سبحان اللہ کہنا اور خدا کو ہر اس چیز سے پاک و منزہ جاننا ہے جو اس کے لائق نہیں یعنی خدا کو اس کے تمام صفات سلبیہ اور ہر قسم کے نقائص، عیوب اور احتیاج سے پاک و منزہ جاننا ہے (ابن منظور، لسان العرب، ج ۲، ص ۴۷۱؛ خلیل بن احمد فراہیدی، العین، ج ۳، ص ۱۵۱و۱۵۲)۔ در اصل اس کا مادہ اور اصلی حروف س، ب، ح ہیں؛ جس کے معنی سباحت اور تیرنے کے ہیں؛ کسی چیز کا تیرنا،

خواہ وہ پانی کی سطح پہ تیر رہی ہو خواہ فضا یا خلا میں اپنے مدار پہ اپنی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے حرکت کر رہی ہو اور چونکہ تیرتے وقت، تیرنے والی چیز یا تیرنے والے انسان کی حرکت معمولی حرکت سے زیادہ ہوتی ہے لہٰذا اس لفظ کے ایک معنی تیز حرکت کرنے کے بھی کئے گئے ہیں جیسا کہ راغب اصفہانی نے مفردات الفاظ القرآن میں اسی کو ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ تسبیح کے اصل معنی: المر السریع فی العبادۃ؛ یعنی عبادت میں سرعت کے ساتھ حرکت کرنے کے ہیں (راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن: ص ۳۹۲). چنانچہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۳۳ میں یہ لفظ اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے؛ ارشاد ہوتا ہے: «وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ»؛ وہ وہی خدا ہے جس نے رات دن اور آفتاب و ماہتاب سب کو پیدا کیا ہے اور سب اپنے اپنے فلک میں تیر رہے ہیں (سورہ انبیاء، آیت: ۳۳)۔

اس لحاظ سے اس لفظ کے باب تفعیل میں معنی کسی شے کو تیرانا یا اس کو اس کی سطح پر باقی رکھنے کے ہیں؛ لہٰذا خدا کی تسبیح کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کو اس کے بلند مقام اور اس کی اعلی و ارفع شان پر برقرار رکھا جائے، اس کی ذات و صفات کے سلسلے میں کوئی ایسا تصور نہ کیا جائے جو اس کی شایان شان نہ ہو؛ اس کے لئے کسی طرح کے عجز، نقص، عیب یا محدودیت کا تصور نہ کیا جائے۔

اسی لئے قرآن مجید میں جب بھی کہیں پر خدا کے لئے کسی کی زبان سے کسی طرح کا کوئی نقص کا شائبہ یا اس کے سلسلے میں کوئی غلط تصور کی بات آئی، تو وہاں فورا لفظ سبحان اور تسبیح کے ذریعے سے اس کی تردید کی گئی؛ جیسا کہ فرشتوں نے روئے زمین پر حضرت آدم ع کے خلیفہ بنانے کی بات پر خدا سے سوال کرنے اور پھر خداوند عالم کے جواب کے بعد جو جملہ زبان پہ جاری کیا وہ یہی تسبیح کا جملہ تھا جس میں انہوں نے خدا کی بارگاہ میں عرض کیا: «قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ»؛ فرشتوں نے کہا: تو پاک و منزہ ہے جو کچھ تو نے ہمیں بتا دیا ہے ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے. یقینا تو ہی بہتر جاننے والا، حکمت والا ہے (سورہ بقرہ، آیت: ۳۲)۔

یا ایک دوسری جگہ پر جب خود خداوند عالم، اولوا الالباب یعنی صاحبان عقل و خرد اور ان کے اعمال و اطوار و افکار کی وضاحت کرنا چاہتا ہے تو اس طرح سے فرماتا ہے: «الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ»؛ جو اٹھتے بیٹھتے اور اپنی کروٹوں پر لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں، (اور کہتے ہیں:)

ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے بے حکمت نہیں بنایا، تیری ذات (ہر عبث سے) پاک ہے، پس ہمیں عذاب جہنم سے بچا لے (سورہ آل عمران، آیت: ۱۹۱)۔

اسی طرح سے قرآن مجید کے متعدد مقامات پر جو «سُبْحَانَ اللهِ عَمَّا يَصِفُونَ»؛ اللہ ان لوگوں کے ہر بیان سے پاک ہے (سورہ صافات، آیت: ۱۵۹؛ سورہ مومنون، آیت: ۹۱)؛ «سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ»؛ آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں (سورہ صافات، آیت: ۱۸۰)؛ «سُبْحَانَ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ»؛ آسمانوں اور زمین کا رب، عرش کا رب، پاکیزہ ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ بیان کر رہے ہیں (سورہ زخرف، آیت: ۸۲)؛ یا « سُبْحَانَ اللهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ» ؛ اللہ اس شرک سے پاک ہے جو یہ کرتے ہیں (سورہ طور، آیت: ۴۳؛ سورہ حشر، آیت: ۲۳ اور سورہ قصص، آیت: ۶۸) جیسے جملات کا استعمال ہوا ہے وہ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کے لیے کسی طرح کے ضعف، عجز، محدودیت اور شرک جیسی چیزوں کا تصور نہ کیا جائے کیونکہ یہ ساری چیزیں اس کی شان ربوبیت کے خلاف ہے۔

البتہ اسی قرآن مجید میں بعض معدود مقامات ایسے بھی ہیں جہاں پر خود خداوند عالم نے اپنی عظمت و بلندی کے اظہار اور نقائص و عیوب سے پاکیزگی کے اعلان کے لئے لفظ تسبیح اور کلمۂ سبحان کا استعمال کیا؛ جیسا کہ سورہ اسراء کی پہلی آیت میں ارشاد ہوا: «سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ»؛ پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں بیشک وہ پروردگار سب کی سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے (سورہ اسراء، آیت: ۱)۔

تسبیح الٰہی کرنے والی چیزیں

ویسے تو خداوند عالم نے سورہ اسراء کی چوالیسویں آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ کائنات کی ہر شے پروردگار عالم کی تسبیح میں مشغول ہے؛ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کی اس تسبیح کو درک کر پا رہے ہوں یا نہیں؛ ارشاد ہوتا ہے: «تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ»؛ اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو یہ اور بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو (سورہ اسراء، آیت: ۴۴)۔

اس آیت میں ان کی اس تسبیح سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں علمائے تفسیر کے درمیان ایک مفصل گفتگو اور بحث ہے جو اس مقالہ کی گنجائش سے باہر ہے؛ بعض نے اس تسبیح سے مراد ان کے فیض وجودی کو لیا ہے یعنی وہ ہر لحظہ اپنے وجود میں اپنے خالق کے محتاج ہونے کے ذریعہ خدا کی تسبیح میں مصروف ہیں؛ بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنی زبان حال کے ذریعہ سے یعنی اپنی نشو و نما، اپنے کمال کی سمت حرکت کرنے کے ذریعے، نظام احسن خلقت کی پیروی کرنے کے ذریعے سے تسبیح الٰہی میں مشغول ہیں لیکن بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں پر تسبیح سے مراد ظاہری تسبیح ہے یعنی زبان قال کے ذریعے سے وہ اللہ تعالی کی تسبیح کر رہی ہیں، اپنی ظاہری زبان سے، اپنی ظرفیت و صلاحیت اور شعور وادراک کے ساتھ خدا کی تسبیح میں مصروف ہیں (اس سلسلے میں مزید اطلاعات اور دقیق معلومات کے لئے سورہ اسراء کی مذکورہ آیت کے ذیل میں تفسیر مجمع البیان، تفسیر المیزان، تفسیر نمونہ اور تفسیر کبیر فخر رازی کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے)۔

یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کی اس تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے یا سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے جیسا کہ بعض روایات میں بھی بعض جانوروں یا پرندوں کے جملات اور ان کی بولی کو کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی کس طرح سے تسبیح میں مصروف رہتے ہیں اور کن جملات کے ذریعہ اسے پکارتے اور اسے یاد کرتے ہی۔

لیکن آیت مذکورہ کے علاوہ بعض دوسری آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں کائنات کی بعض چیزوں کا صراحت کے ساتھ نام لے کر کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح میں مشغول و مصروف ہیں؛ جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ملائکہ: ملائکہ کی تسبیح کا ذکر قرآن مجید کی متعدد آیات میں موجود ہے. جیسے: سورہ رعد کی مذکورہ بالا تیرہویں آیت میں بجلی کی گرج کے بعد ملائکہ کا ذکر ہے. یا ایک دوسری آیت میں اس طرح تذکرہ ہوا:

« وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ»؛ اور آپ فرشتوں کو عرش کے گرد حلقہ باندھے ہوئے اپنے رب کی ثنا کے ساتھ تسبیح کرتے ہوئے دیکھیں گے (سورہ زمر، آیت ۷۵)؛ اسی طرح ایک جگہ ارشاد ہوا: «الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ»؛ جو فرشتے عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد معین ہیں سب حمد خدا کی تسبیح کر رہے ہیں (سورہ غافر آیت ۷)۔ ان آیات کے علاوہ سورہ بقرہ کی تیسویں اور سورہ شوری کی پانچویں آیت میں بھی ان کے تسبیح الٰہی انجام دینے کا ذکر ہے۔

۲۔ ساتوں آسمان: ارشاد ہوتا ہے:

«تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا»؛ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اس کی تسبیح کررہے ہیں اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو یہ اور بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو. پروردگار بہت برداشت کرنے والا اور درگذر کرنے والا ہے (سورہ اسراء، آیت ۴۴)۔

۳۔ زمین: سورہ اسراء کی مذکورہ بالا آیت میں ساتوں آسمان کے بعد زمین کے تسبیح کرنے کا بھی تذکرہ ہے۔

۴۔ پہاڑ:

ارشاد ہوتا ہے:

«وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُودَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِينَ»؛ اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کے لیے مسخر کیا جو ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور ایسا کرنے والے ہم ہی تھے (یا ہم ایسے کام کرتے ہی رہتے ہیں. سورہ انبیاء، آیت: ۷۹)۔

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

«إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ»؛ ہم نے ان کے لئے پہاڑوں کو تسخر کردیا تھا کہ ان کے ساتھ صبح و شام تسبیح پروردگار کریں (سورہ ص، آیت: ۱۸)۔

۵۔ پرندے: سورہ انبیاء کی مذکورہ بالا آیت میں پہاڑوں کے بعد پرندوں کے تسبیح کرنے کا ذکر ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ:

«أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ»؛ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے لئے زمین و آسمان کی تمام مخلوقات اور فضا کے صف بستہ طائر سب تسبیح کررہے ہیں اور سب اپنی اپنی نماز اور تسبیح سے باخبر ہیں اور اللہ بھی ان کے اعمال سے خوب باخبر ہے (سورہ نور: ۴۱)۔

۶۔ رعد (بجلی کی گرج): ارشاد ہوتا ہے:

« وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ»؛ اور (بجلی کی) گرج اس کی ثنا کے ساتھ اور فرشتے اس کے خوف سے لرزتے ہوئے تسبیح کرتے ہیں (سورہ رعد، آیت: ۱۳)۔

۷۔ تمام موجودات و مخلوقات: سورہ اسراء کی مذکورہ بالا چوالیسویں آیت میں اور اسی طرح بعض مسبحات سوروں کی ابتدائی آیتیں جیسے سورہ جمعہ کی پہلی آیت یا سورہ نور کی مذکورہ بالا اکتالیسویں آیت میں اس بات کا ذکر آیا ہے۔ بس اس فرق کے ساتھ

کہ سورہ جمعہ میں «يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ» آیا ہے سورہ نور میں «مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ» آیا ہے؛ گویا اس طرح سے یہ اعلان ہو گیا کہ ہر ذی شعور و غیر ذی شعور خدا کی تسبیح میں مصروف ہے۔اس لئے کہ عربی زبان میں عام طور پر حرف "ما" غیر ذی شعور کے لئے اور حرف "من" ذی شعور کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؑ اور تسبیح الہی

تسبیح الہی اور حضرت فاطمہ زہراؑ کے درمیان ایک خاص تعلق اور ایک اہم رابطہ پایا جاتا ہے جس کی سب سے اہم دلیل خود تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ ہے جو خداوند عالم کی ایک خاص تسبیح اور اس کے ذکر کا ایک اہم وسیلہ اور ذریعہ ہے اور آپ ہی کے نام گرامی سے منسوب اور مشہور ہے؛اس کی عظمت و اہمیت اور آثار و برکات پر بعد میں تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

اس خاص تسبیح کے علاوہ خود آپ کی زندگی میں تسبیح اور ذکر الہی کا کردار و اہمیت، حتی قبل از خلقت، عالم انوار میں بھی آپ کا تسبیح و تہلیل و تحمید الہی میں مصروف و مشغول رہنا متعدد روایات میں وارد ہوا ہے:

خلقت عالم و آدمؑ سے پہلے آپؑ کی خلقت اور تسبیح

حضرت فاطمہ زہراؑ کی نورانی خلقت اور اس زمانے میں آپ کی تسبیح و تہلیل کے سلسلے میں سدیر صیرفی، حضرت امام صادقؑ سے اور آپؑ اپنے والد بزرگوار حضرت امام باقرؑ اور وہ اپنے جد حضرت رسول خداؐ سے نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا:

«خُلِقَ نُورُ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ قَبْلَ أَنْ تُخْلَقَ الْأَرْضُ وَ السَّمَاءُ فَقَالَ بَعْضُ النَّاسِ يَا نَبِيَّ اللَّهِ فَلَيْسَتْ هِيَ إِنْسِيَّةً فَقَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ فَاطِمَةُ حَوْرَاءُ إِنْسِيَّةٌ قَالَ يَا نَبِيَّ اللَّهِ وَ كَيْفَ هِيَ حَوْرَاءُ إِنْسِيَّةٌ قَالَ خَلَقَهَا اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْ نُورِهِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ آدَمَ إِذْ كَانَتِ الْأَرْوَاحُ فَلَمَّا خَلَقَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ آدَمَ عُرِضَتْ عَلَى آدَمَ قِيلَ يَا نَبِيَّ اللَّهِ وَ أَيْنَ كَانَتْ فَاطِمَةُ قَالَ كَانَتْ فِي حُقَّةٍ تَحْتَ سَاقِ الْعَرْشِ قَالُوا يَا نَبِيَّ اللَّهِ فَمَا كَانَ طَعَامُهَا قَالَ التَّسْبِيحُ وَ التَّهْلِيلُ وَ التَّحْمِيد»؛ حضرت فاطمہ زہراؑ کا نور زمین و آسمان کی خلقت سے قبل خلق ہوا ہے؛ تو (یہ سن کر) بعض لوگوں نے سوال کر لیا: اے نبی خدا: کیا حضرت فاطمہ زہراؑ انسانوں میں سے نہیں ہیں (بشر نہیں ہیں)؟۔ تو آپ نے فرمایا: فاطمہ زہراؑ حور کی شکل میں ایک انسان (الحوراء الانسیہ) ہیں؛ پھر سوال ہوا: اے نبی خداؐ! وہ انسانی شکل میں ایک حور کیسے ہو سکتی ہیں؟ (وضاحت فرمائیں)۔آپؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالی نے حضرت آدمؑ کی خلقت سے پہلے، اپنے نور سے فاطمہؑ کو خلق فرمایا اور یہ عالم ارواح کی بات ہے؛ اس کے بعد جب خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کو خلق کیا اور ان کے

سامنے حضرت فاطمہ زہراؑ کے نور کو پیش کیا۔ پھر سوال ہوا کہ اے نبی خداؐ! اس وقت فاطمہؑ کہاں تھیں (ان کا مقام اور ٹھہرنے کی جگہ کیا تھی)؟۔آپؐ نے ارشاد فرمایا: اس وقت حضرت فاطمہ زہراؑ ساقہ عرش کے نیچے ایک مخصوص جگہ پر موجود تھیں۔ لوگوں نے پھر سوال کیا کہ اے نبی خداؐ! اس وقت فاطمہ کی غذا کیا تھی؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: تسبیح و تہلیل و تحمید خدا، فاطمہؑ کی غذا تھی (شیخ صدوق، معانی الاخبار، ج ۱، ص ۳۹۶؛ سید ہاشم بحرانی، البرہان فی تفسیر القرآن، ج ۴، ص ۳۳۷)۔

اس حدیث سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی خلقت، حضرت آدمؑ کی تخلیق سے پہلے ہوئی ہے اور آپؑ عالم انوار میں عرش الٰہی کے زیر سایہ تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتیں اور ذکر و تسبیح الٰہی سے تقویت حاصل کرتی تھیں۔اس حدیث کے بعد والے جملات میں حضرت فاطمہ زہراؑ کی ولادت کے لئے مخصوص اہتمام اور آپؑ کے لقب "منصورہ" کی علت اور نام "فاطمہ" کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے۔

عالم انوار کی مخلوقات اور ملائکہ کو تسبیح کی تعلیم

جابر بن عبد اللہ انصاری سے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: «إِنَّ اَللهَ عَزَّ وَ جَلَّ خَلَقَنِي وَ عَلِيّاً وَ فَاطِمَةَ وَ اَلْحَسَنَ وَ اَلْحُسَيْنَ مِنْ نُورٍ فَعَصَرَ ذَلِكَ اَلنُّورَ عَصْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا شِيعَتُنَا فَسَبَّحْنَا فَسَبَّحُوا وَ قَدَّسْنَا فَقَدَّسُوا وَ هَلَّلْنَا فَهَلَّلُوا وَ مَجَّدْنَا فَمَجَّدُوا وَ وَحَّدْنَا فَوَحَّدُوا ثُمَّ خَلَقَ اَلسَّمَاوَاتِ وَ اَلْأَرَضِينَ وَ خَلَقَ اَلْمَلاَئِكَةَ فَمَكَثَتِ اَلْمَلاَئِكَةُ مِائَةَ عَامٍ لاَ تَعْرِفُ تَسْبِيحاً وَ لاَ تَقْدِيساً فَسَبَّحْنَا فَسَبَّحَتْ شِيعَتُنَا فَسَبَّحَتِ اَلْمَلاَئِكَةُ وَ كَذَلِكَ فِي اَلْبَوَاقِي»؛ بہ تحقیق خداوند عالم نے میرا، علیؑ کا، فاطمہؑ کا اور حسنؑ اور حسینؑ کا نور، ایک نور سے پیدا کیا پھر اس نور کو نچوڑا نچوڑنے کی طرح تو اس میں سے ہمارے شیعہ وجود میں آئے، لہٰذا ہم نے تسبیح الٰہی کی تو ہمارے شیعوں نے تسبیح الٰہی کی، ہم نے تقدیس الٰہی انجام دی تو ہمارے شیعوں نے تقدیس الٰہی انجام دی، ہم نے تہلیل و تمجید پروردگار کی تو ہمارے شیعوں نے تہلیل و تمجید پروردگار کی، ہم نے اس کی توحید و وحدانیت کا اقرار کیا تو ہمارے شیعوں نے بھی توحید و وحدانیت کا اقرار کیا، اس کے بعد خداوند عالم نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور پھر ملائکہ کو پیدا کیا ملائکہ ایسے ہی سو سال تک ٹھہرے رہے نہ ان کو تسبیح کرنا آتی تھی نہ تقدیس؛ جب ہم نے تسبیح کی اور ہمارے شیعوں نے تسبیح کی تو پھر اس کے بعد ملائکہ نے تسبیح کی، اسی طرح سے دوسرے امور بھی انجام دیئے، یعنی ہماری اور ہمارے شیعوں کی تقدیس و تہلیل و تمجید اور توحید کے اقرار کے بعد فرشتوں نے

بھی ان چیزوں کا اقرار و اظہار کیا (علی بن عیسی اربلی، کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ، ج۱، ص ۴۵۸)۔

اس حدیث میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ عالم انوار اور عالم ارواح میں شیعوں کی تسبیح کو، محمدؐ و آل محمدؐ کی ذوات مقدسہ کے طفیل اور ان کی خاص تعلیمات کے سبب، ملائکہ کی تسبیح پر مقدم کیا گیا اور ایک خاص طرح کی برتری و تفوق عطا کیا گیا ہے۔

اس حدیث کو حسن بن سلیمان حلی نے بھی اپنی کتاب المحتضر میں صفحہ ۲۰۲ پر نقل کیا ہے اور اسی طرح علامہ مجلسی نے بھی اپنی کتاب بحار الانوار کی جلد ۲۷ میں صفحہ ۸۰ پر مذکورہ کتاب کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ سے نقل کیا ہے۔

البتہ اس روایت کے علاوہ دوسری بہت سی روایات ایسی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ انوار محمدؐ و آل محمدؐ نے مستقیم و بلا واسطہ فرشتوں کو تسبیح و تہلیل و تقدیس الٰہی کی تعلیم عطا فرمائی، اگر انوار محمدؐ و آل محمدؐ کی یہ تعلیم نہ ہوتی تو فرشتوں کو بالکل معلوم نہ ہوتا کہ خدا کی تسبیح و تہلیل و تقدیس کیا ہوتی ہے اور کس طرح سے انجام دی جاتی ہے؟۔

البتہ اس مضمون اور مفہوم کی اکثر روایات میں شیعہ کا لفظ موجود نہیں ہے (شیخ مفید، الاختصاص، ج۱، ص۹۱۔ شیخ صدوق، علل الشرائع، ج۱، ص۵۔ شیخ ہاشم بحرانی، البرہان فی تفسیر القرآن، ج۴، ص ۶۳۵۔ مدینۃ معاجز الائمۃ الاثنی عشر و دلائل الحجج علی البشر، ج ۲، ص ۳۷۱۔ حسن بن سلیمان حلی، المحتضر، ج۱، ص ۷۹ و ۲۸۶)۔

بہر حال لفظ شیعہ کے درمیان میں ہونے یا نہ ہونے سے عظمت اہل بیتؑ میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ ان کی شان و منزلت میں کوئی کمی واقع ہونے والی نہیں ہے اور اگر لفظ شیعہ کو درمیان میں مان بھی لیا جائے اور یہ تسلیم کر لیا جائے کہ پہلے اہل بیت پھر شیعہ اور اس کے بعد فرشتوں نے تسبیح کی تو اس سے صرف یہی نہیں کہ اہل بیت کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آئے گا بلکہ ان کی عظمت اور دوبالا ہو جائے گی کہ ان کے ماننے والوں کا، ان کے شیعوں کا یہ عالم ہے کہ ان کے توسط سے فرشتوں نے تسبیح و تقدیس الٰہی سیکھی تو پھر خود ان اہل بیت کا عالم کیا ہوگا، خود ان کی منزلت کیا ہوگی؛ اور خاص کر یہاں پر ان شیعوں کا تذکرہ ہو رہا ہے جو انوار اہل بیتؑ سے وجود میں آئے ہیں، کسی عام فرد یا کسی معمولی انسان کا تذکرہ نہیں ہو رہا ہے۔

آخر امر میں یہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ یہ سب عالم انوار کی باتیں ہیں، ان کے اہل ان کو اچھی طرح سے جانتے ہیں؛ نہ ہمارے اوپر وہاں کی حقیقت روشن ہے اور نہ ہی اس کی حقیقت کو ہم کما حقہ سمجھ سکتے ہیں۔

تسبیح فاطمہ زہراؑ کی علت تشریع اور سبب ورود

شیخ صدوق اپنی کتاب علل الشرائع میں ایک طولانی روایت کے ذریعے، تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کے ورود اور اس کی علت تشریع کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے بنی اسد کے ایک شخص سے بیان فرمایا: کیا میں تم کو اپنے اور فاطمہؑ کے بارے میں ایک خاص خبر سے آگاہ نہ کروں؟!۔

حضرت فاطمہ زہراؑ میرے گھر میں رسول خداؐ کی سب سے زیادہ عزیز تھیں، آپ نے اتنی زیادہ چکی چلائی کہ آپ کے ہاتھوں پر گٹاپڑ گیا تھا، کنویں سے اس قدر پانی نکالا کہ اس کا اثر آپ کے بدن پر نمایاں ہو گیا تھا اور آپ گھر میں اس قدر صفائی کرتی تھیں کہ آپ کے کپڑے خاک آلود ہو جاتے تھے، آپ چولہا جلا کر کھانا پکاتی تھیں لہٰذا آپ کے لباس گرد آلود نظر آتے تھے، آپ گھر اور گھر والوں کے لئے نہایت زحمت اور مشقت اٹھاتی تھیں؛ لہٰذا جب میں نے ایک دن یہ سنا کہ حضرت رسول خداؐ کے پاس کچھ غلام اور کنیز لائے گئے ہیں تو فاطمہؑ سے کہا کہ اب کی بار جب اپنے باباؐ کی خدمت میں جانا اور اگر ممکن ہو سکے تو ایک خادم کا تقاضا کرنا تاکہ وہ تمہارے کاموں میں تمہاری مدد کر سکے اور آپ کو اتنی زیادہ زحمت و مشقت سے کچھ حد تک آرام مل جائے؛ چنانچہ ایک دن جناب فاطمہ زہراؑ، رسول خداؐ کے پاس گئیں اور دیکھا کہ کچھ لوگ آپ کے ساتھ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں اس لئے شرم و حیا کی وجہ سے اپنے بابا سے کچھ بھی کہے بغیر واپس لوٹ آئیں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں چونکہ رسول خداؐ یہ جان گئے تھے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کسی ضرورت کے تحت آپ کے پاس آئی تھیں اور واپس چلی گئی ہیں لہٰذا آپ خود ہمارے گھر تشریف لائے؛ اس وقت ہم آرام کر رہے تھے آپ حضرت فاطمہ زہراؑ کے سرہانے بیٹھ گئے اور فاطمہؑ نے شرم و حیا کی وجہ سے آپ سے کچھ عرض نہ کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے میری عزیز فاطمہؑ! آپ کس مقصد سے میرے پاس آئی تھیں؟۔ آپ نے دوبار یہ سوال دہرایا لیکن حضرت فاطمہؑ خاموش رہیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: میں نے خود رسول اللہؐ کی بارگاہ میں عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں آپ سے اس کی وجہ بیان کرتا ہوں، یہ کہہ کر حضرت فاطمہ زہراؑ کی ان تمام مشقتوں اور زحمتوں کا تذکرہ کیا جو آپ اپنے گھر اور گھر والوں کے لئے انجام دیتی تھیں اور پھر عرض کیا کہ میں نے ہی ان سے کہا تھا کہ وہ آپ کی خدمت میں جائیں اور ایک خادم اور نوکر کا آپ سے مطالبہ کرلے، جو ہماری مدد کر سکے تو رسول خدا حضرت محمد مصطفیؐ نے ارشاد فرمایا: (کیا میں) تمہیں ایک ایسی چیز بتاؤں جو تمہارے لئے اس خادم

اور نوکر سے جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو کئی درجے بہتر ہو. (یاد رکھو) جب بھی نیند سے اٹھنے لگو (بعض روایات میں ہے کہ جب بھی بستر پر جانے لگو) تو تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمدللہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہو۔ یہ اس خادم و نوکر سے (کئی درجہ) بہتر ہے جو تمہاری خدمت کرے۔ یہ سن کر حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرط مسرت سے تین مرتبہ اپنی زبان پہ جملہ جاری کیا:

"میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے (ہر امر میں) راضی ہوں، میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے (ہر امر میں) راضی ہوں، میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے (ہر امر میں) اپنی رضایت کا اعلان کرتی ہوں"۔

(شیخ صدوق، علل الشرائع، ج ۲، ص ۳۶۶)۔

روایت کے طولانی ہونے مد نظر اس کے عربی متن کو ذکر نہیں کیا گیا۔

علل الشرائع کی اس اہم روایت کے بارے میں کچھ اہم باتوں کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہے:

پہلی بات یہ کہ اس روایت کے اندر کیفیت تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کے سلسلے میں مختصر سا فرق پایا جاتا ہے وہ یہ کہ اذکار تسبیح میں ترتیب برعکس ہے یعنی پہلے تسبیح (**سبحان اللہ**) پھر تحمید (**الحمدللہ**) اور آخر میں تکبیر (**اللہ اکبر**) کا ذکر ہے جبکہ تعداد اذکار میں کوئی فرق نہیں ہے؛ صرف تسبیح مقدم، تکبیر مؤخر (اور تحمید وسط میں اپنی جگہ پر موجود) ہے؛ جو شیعوں کے مشہور طریقۂ تسبیح (پہلے تکبیر پھر تحمید اور آخر میں تسبیح کی روش) کے خلاف ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس ترتیب کو مانا جائے اور تسبیح کے کس طریقہ پر عمل کیا جائے؟

اس سوال کے مختلف جوابات دیئے جا سکتے ہیں جن میں سب سے پہلا جواب یہ ہے کہ جس طرح سے اس روایت میں صراحت کے ساتھ ذکر ہوا کہ جب سونے کا ارادہ کرو، جب بستر پہ جانے لگو، تو سوتے وقت ایسے تسبیح پڑھو؛ تو یہ تسبیح سوتے وقت سے مخصوص ہے نہ یہ کہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ایسے ہی تسبیح پڑھی جائے گی۔

دوسرا جواب یہ کہ شیخ صدوق نے یہاں پر اہل سنت کی سند اور ان کے طریق سے اس روایت کو نقل کیا ہے یعنی ان کے رجال سند پر بھروسہ کیا ہے ایسی صورت میں اگر اذکار تسبیح جا بجا ہو جائیں تو مشہور شیعہ روش پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ خود شیخ صدوق نے ہی اپنی ایک اور اہم کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" جس کا شمار شیعوں کی کتب اربعہ میں ہوتا ہے اس میں جب اس واقعہ (جناب فاطمہ زہراؑ کے خادم طلب کرنے اور رسول خداؐ کے تسبیح کی تعلیم دینے کے واقعہ) کو نقل کیا ہے تو وہاں پر مشہور شیعہ ترتیب اور روش کو ہی مد نظر قرار دیا ہے (شیخ صدوق،

من لایحضرہ الفقیہ، ج۱ص ۳۲۰-۳۲۱)؛ گرچہ انہوں نے اس روایت کو مرفوعاً نقل کیا ہے۔

تیسرا جواب یہ کہ اس واقعہ سے صرف نظر کرتے ہوئے جو شیخ صدوق نے اہل سنت کے طریق سے نقل کیا، خود شیعہ منابع حدیثی میں بالخصوص قدیمی منابع میں بعض بلکہ متعدد ایسی احادیث موجود ہیں جن میں تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کی کیفیت اور روش کا صراحت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے، جس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے؛ ان میں سے تین اہم روایات کا تذکرہ بعد میں، تسبیح فاطمہ زہراؑ کی کیفیت اور صحیح طریقہ کہ عنوان کے ذیل میں کیا جائے گا۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ دیگر احتمالات بھی اس سلسلے میں دیئے گئے ہیں جیسا کہ شیخ حر عاملی نے میں اپنی کتاب وسائل الشیعہ میں بھی شیخ صدوق کی علل الشرائع والی روایت کے سلسلے میں نسخ اور تقیہ جیسے احتمال بھی دیئے ہیں اور آخر میں ایک اس احتمال کا بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ روایت زیادہ سے زیادہ مذکورہ ترتیب کے جواز کی طرف اشارہ کرتی ہے، وجوب کی طرف نہیں (شیخ حر عاملی، تفصیل وسائل الشیعہ الی تحصیل مسائل الشریعہ، ج۶، ص ۴۴۶)۔ انہوں نے اپنی اسی کتاب میں حضرت فاطمہ زہراؑ کی تسبیح کی کیفیت، کمیت اور ترتیب کے سلسلے میں ایک مستقل باب قرار دیا ہے جس میں روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد مشہور طریقہ تسبیح کو ہی «علیه عمل الطائفة» کہا ہے یعنی یہی شیعوں کا طریقہ تسبیح ہے (شیخ حر عاملی، تفصیل وسائل الشیعہ الی تحصیل مسائل الشریعہ، ج۶، ص ۴۴۵)۔

تسبیح فاطمہ زہراؑ کی کیفیت اور صحیح طریقہ

تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کی کیفیت اور اس کے صحیح طریقہ کو بیان کرنے کے لئے یہاں تین اہم روایات کا تذکرہ کیا جارہا ہے، جن کو قدیم شیعہ علماء نے اپنی اہم ترین حدیثی کتابوں میں جگہ دی ہے اور اپنی اسناد کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے:

پہلی روایت

شیخ کلینی اپنی سند کے ساتھ محمد ابن عذافر سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: «دَخَلْتُ مَعَ أَبِي عَلَى أَبِي عَبْدِ اللهِ(ع)- فَسَأَلَهُ أَبِي عَنْ تَسْبِيحِ فَاطِمَةَ(ع)- فَقَالَ اللهُ أَكْبَرُ حَتَّى أَحْصَى أَرْبَعاً وَ ثَلَاثِينَ مَرَّةً ثُمَّ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ حَتَّى بَلَغَ سَبْعاً وَ سِتِّينَ ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَ اللهِ حَتَّى بَلَغَ مِائَةً يُحْصِيهَا بِيَدِهِ جُمْلَةً وَاحِدَةً»؛ "میں اپنے والد گرامی کے ساتھ حضرت امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے والد نے امام سے تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے ۳۴ مرتبہ شمار کر کے "اللہ اکبر" کہا پھر اس کے بعد اتنی مرتبہ "الحمد للہ" کہا کہ ۶۷ کی عدد

مکمل ہوگئی (یعنی ۳۳ مرتبہ)؛ پھر اس کے بعد اتنی مرتبہ "سبحان اللہ" کہا کہ ۱۰۰ کی عدد مکمل ہوگئی (یعنی ۳۳ مرتبہ)؛ اس کو آپ اپنی انگلیوں پہ شمار کرتے جارہے تھے اور یہ سارے اذکار آپ نے ایک دفعہ میں بغیر کسی فاصلے اور توقف کے انجام دیئے" (شیخ کلینی، الکافی، ج۳، ص ۳۴۲؛ شیخ طوسی، تہذیب الاحکام، ج۲، ص ۱۰۵-۱۰۶)۔

یاد رہے کہ احمد ابن محمد ابن خالد برقی نے اپنی کتاب محاسن میں جو ان دونوں (شیخ کلینی اور شیخ طوسی کی کتابوں) سے بھی قدیم کتاب ہے، اس میں اسی روایت کو ایک الگ سند کے ساتھ ذکر کیا ہے (مراجعہ کریں: احمد ابن محمد ابن خالد برقی، المحاسن، ج۱، ص ۳۶)۔

دوسری روایت

مرحوم کلینی نے اپنی سند کے ساتھ ابو بصیر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس میں آیا ہے کہ:

«قَالَ (ع) فِي تَسْبِيحِ فَاطِمَةَ ص يُبْدَأُ بِالتَّكْبِيرِ أَرْبَعاً وَ ثَلَاثِينَ ثُمَّ التَّحْمِيدِ ثَلَاثاً وَ ثَلَاثِينَ ثُمَّ التَّسْبِيحِ ثَلَاثاً وَ ثَلَاثِينَ»؛ حضرت امام صادقؑ نے تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کے سلسلے میں اس طرح سے ارشاد فرمایا: یہ تسبیح ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد ۳۳ مرتبہ الحمدللہ ہے اور اس کے بعد (آخر میں) ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ہے (شیخ کلینی، الکافی، ج۳، ص ۳۴۲)۔ اسی روایت کو شیخ طوسی نے بھی اپنی کتاب تہذیب الاحکام میں جلد ۲ صفحہ ۱۰۶ پر نقل کیا ہے۔

تیسری روایت

شیخ طوسی نے اپنی کتاب تہذیب الاحکام میں ماہ مبارک رمضان کے مستحب اعمال اور مستحب نمازوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک حدیث میں ماہ رمضان کی مخصوص مستحبی نماز کے سلام پڑھنے کے بعد تسبیح فاطمہ زہرا پڑھنے کی سفارش فرمائی اور اس کے بعد پھر خود آپ نے اس تسبیح فاطمہؑ کو پڑھنے کا طریقہ بیان کیا ہے۔ روایت کا متن اس طرح سے ہے کہ:

« فَإِذَا سَلَّمْتَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ سَبِّحْ تَسْبِيحَ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ ع وَ هُوَ اللَّهُ أَكْبَرُ أَرْبَعاً وَ ثَلَاثِينَ مَرَّةً وَ الْحَمْدُ لِلَّهِ ثَلَاثاً وَ ثَلَاثِينَ مَرَّةً وَ سُبْحَانَ اللَّهِ ثَلَاثاً وَ ثَلَاثِينَ مَرَّةً فَوَ اللَّهِ لَوْ كَانَ شَيْئاً أَفْضَلُ مِنْهُ لَعَلَّمَهُ رَسُولُ اللَّهِ ص إِيَّاهَا»؛ "جب دونوں رکعت مکمل کرلو اور سلام پڑھ لو تو تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ پڑھو! جو ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ہے؛ خدا کی قسم! اگر اس تسبیح سے برتر اور افضل کوئی اور چیز ہوتی تو رسول خداؐ حتماً حضرت فاطمہ زہراؑ کو حتما اسی چیز کی تعلیم فرماتے" (شیخ طوسی، تہذیب الاحکام، ج۳، ص ۶۷)۔

مذکورہ تینوں روایتوں سے تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ پڑھنے کا صحیح طریقہ اور اذکار کی ترتیب بخوبی واضح

اور روشن ہو جاتی ہے۔اور وہ طریقے جو آج تسبیح کے سلسلے میں ہمارے درمیان رائج ہے، اس کی اہم علت بھی یہی حدیثیں یا اس طرح کی احادیث ہی ہیں۔

تسبیح فاطمہ زہراؑ کے اہم آثار و برکات

احادیث معصومینؑ میں تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کے بہت زیادہ آثار و برکات اور فائدے بیان کئے گئے ہیں؛ جن میں سے چند اہم چیزوں کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جارہا ہے:

۱۔ حسن عاقبت کی ضمانت

حضرت امام صادقؑ نے ابو ہارون مکفوف سے ارشاد فرمایا:

«يَا أَبَا هَارُونَ إِنَّا نَأْمُرُ صِبْيَانَنَا بِتَسْبِيحِ الزَّهْرَاءِ(ع) كَمَا نَأْمُرُهُمْ بِالصَّلَاةِ فَالْزَمْهُ فَإِنَّهُ لَمْ يَلْزَمْهُ عَبْدٌ فَيَشْقَى»؛"اے ابو ہارون! جس طرح سے ہم اپنے بچوں کو نماز کا حکم دیتے ہیں اسی طرح سے ان کو تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ کا بھی حکم دیتے ہیں اور اس پر مداومت رکھو، اسے مسلسل پڑھتے رہو (اسے ترک نہ کرنا) اس لئے کہ اسے مسلسل پڑھنے والا کبھی شقی اور بدبخت نہیں ہو سکتا"۔ (شیخ کلینی، الکافی، ج۳، ص۳۴۳۔ شیخ صدوق، ثواب الأعمال و عقاب الأعمال، ص: ۱۶۳)۔

۲۔ ہزار رکعت نماز سے بہتر

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں: «تَسْبِيحُ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ (ع) فِي كُلِّ يَوْمٍ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ صَلَاةِ أَلْفِ رَكْعَةٍ فِي كُلِّ يَوْمٍ»؛"روزانہ ہر نماز کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ کی پڑھنا، میرے نزدیک روزانہ ہزار رکعت نماز پڑھنے سے زیادہ محبوب ہے"۔ (شیخ کلینی، الکافی، ج۳، ص ۳۴۳۔ شیخ صدوق، ثواب الأعمال و عقاب الأعمال، ص: ۱۶۳)۔

۳۔ بہترین وسیلۂ استغفار

محمد ابن مسلم کی روایت ہے کہ امام باقرؑ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ سَبَّحَ تَسْبِيحَ الزَّهْرَاءِ ع ثُمَّ اسْتَغْفَرَ غُفِرَ لَهُ»؛"جو شخص تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ پڑھے اور اس کے بعد استغفار کرے تو اللہ اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے"(شیخ صدوق، ثواب الأعمال و عقاب الأعمال، ص ۱۶۳)۔

۴۔ سنگینی میزان کا سبب

اسی حدیث مذکور بالا میں امام کا ایک جملہ ہے:

«هِيَ مِائَةٌ بِاللِّسَانِ وَ أَلْفٌ فِي الْمِيزَانِ»؛"یہ تسبیح زبان پر سو (عدد) لیکن میزان میں ہزار (حساب) ہوتی ہے"(شیخ صدوق، ثواب الأعمال و عقاب الأعمال، ص ۱۶۳)۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہا

جائے کہ تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ بولنے میں سو لیکن تولنے میں ہزار ہوتی ہے۔

۵۔ دوری شیطان اور قرب رحمان کا ذریعہ

اسی حدیث مذکور بالا میں امام نے ارشاد فرمایا:

«وَ تَطْرُدُ الشَّيْطَانَ وَ تُرْضِي الرَّحْمَنَ»؛ "اور اس تسبیح کے ذریعے سے شیطان دور ہوتا ہے اور رحمان راضی ہوتا ہے" (شیخ صدوق، ثواب الأعمال و عقاب الأعمال، ص ۱۶۳)۔

۶۔ گناہوں کی بخشش کا ذریعہ

حضرت امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَنْ سَبَّحَ تَسْبِيحَ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ ع قَبْلَ أَنْ يَثْنِيَ رِجْلَيْهِ مِنْ صَلَاةِ الْفَرِيضَةِ غَفَرَ اللَّهُ لَهُ وَ لْيَبْدَأْ بِالتَّكْبِيرِ»؛ "جو شخص بھی نماز واجب کے بعد اپنا پیر سمیٹنے سے پہلے (یعنی نماز کی حالت سے پلٹنے، تشہد و رو بہ قبلہ کی حالت سے خارج ہونے سے پہلے) تسبیح فاطمہ زہراؑ پڑھتا ہے تو اللہ تعالی اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے؛ اور انسان کو چاہئے کہ تسبیح فاطمہؑ کی شروعات تکبیر سے کرے" (شیخ کلینی، الکافی، ج ۳، ص ۳۴۲)۔

اس روایت کے آخر میں جو جملہ وارد ہوا ہے: «وَ لْيَبْدَأْ بِالتَّكْبِيرِ»، وہ کیفیت و ترتیب اذکار تسبیح فاطمہ زہراؑ کی طرف اشارہ ہے لہٰذا گذشتہ بیان میں ذکر ہونے والی تین اہم روایتوں کی طرح، یہ روایت بھی تسبیح فاطمہ زہراؑ کے تکبیر سے شروع ہونے پر ایک بہترین شاہد ہے۔

تسبیح فاطمہ زہراؑ کے ذریعہ گناہوں کی بخشش کے سلسلے میں ایک دوسری حدیث میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ:

«مَنْ سَبَّحَ اللَّهَ فِي دُبُرِ الْفَرِيضَةِ تَسْبِيحَ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ ع الْمِائَةَ مَرَّةٍ وَ أَتْبَعَهَا بِلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ غَفَرَ اللَّهُ لَهُ»؛ "جو شخص اپنی واجب نماز کے بعد تسبیح فاطمہ زہراؑ جو کہ سو (۱۰۰) عدد (اذکار) پر مشتمل ہے، پڑھے؛ اور اس کے بعد بلا فاصلہ، لا الہ الا اللہ کہے تو خداوند عالم اس کو بخش دیتا ہے" (شیخ کلینی، الکافی، ج ۳، ص ۳۴۲)۔

۷۔ حمد و عبادت الٰہی کا بہترین ذریعہ

حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَا عُبِدَ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِنَ التَّحْمِيدِ أَفْضَلَ مِنْ تَسْبِيحِ فَاطِمَةَ (ع)»؛ "تسبیح فاطمہ زہراؑ سے بہتر کسی اور طریقے سے اللہ کی حمد و عبادت نہیں کی گئی" (شیخ کلینی، الکافی، ج ۳، ص ۳۴۲)۔

۸۔ بہترین ہدیۂ الٰہی

اسی حدیث مذکور کے ذیل میں امام نے فرمایا:

«وَ لَوْ كَانَ شَيْءٌ أَفْضَلَ مِنْهُ لَنَحَلَهُ رَسُولُ اللَّهِ ص فَاطِمَةَ (ع)»؛ "اگر کوئی چیز اس تسبیح سے افضل اور بہتر ہوتی تو حتماً رسول خداؐ اسی چیز کو جناب فاطمہ زہراؑ کو ہدیہ کے طور پہ عطا فرماتے" (شیخ کلینی، الکافی، ج۳، ص۳۴۲)۔

۹۔ ذکر کثیر کا مصداق

زرارہ بن اعین نقل کرتے ہیں کہ امام صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

«تَسْبِيحُ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ ع- مِنَ الذِّكْرِ الْكَثِيرِ الَّذِي قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ- اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْراً كَثِيراً»؛ "قرآن مجید میں جو خداوند عالم نے حکم دیا ہے: "اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا کرو، اس کا ذکر کثیر کیا کرو" تو تسبیح فاطمہ زہراؑ ہی ذکر کثیر ہے" (شیخ کلینی، الکافی، ج۲ص۵۰۰)۔

احادیث معصومینؑ میں ذکر کثیر کرنے کے بہت سے فائدے بیان کئے گئے ہیں؛ جن میں سے بعض آثار و فوائد کے سلسلے میں چند روایات مندرجہ پیش کی جارہی ہیں:

حضرت امام صادقؑ، رسول خداؐ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: «مَنْ أَكْثَرَ ذِكْرَ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ أَحَبَّهُ اللَّهُ وَ مَنْ ذَكَرَ اللَّهَ كَثِيراً كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَتَانِ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ وَ بَرَاءَةٌ مِنَ النِّفَاقِ»؛ "خدا کا زیادہ ذکر کرنے والا، خدا کا محبوب ہو جاتا ہے؛ جو خدا کو زیادہ یاد کرتا ہے وہ ہمیشہ دو چیز سے دور رہتا ہے ایک جہنم کی آگ اور دوسرے نفاق سے" (شیخ کلینی، الکافی، ج۲، ص۵۰۰)۔

اسی طرح حضرت امام صادقؑ نے فرمایا: «شِيعَتُنَا الَّذِينَ إِذَا خَلَوْا ذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيراً»؛ "ہمارے شیعہ ہی وہ ہیں جو خلوت کے وقت خدا کا زیادہ ذکر کرتے ہیں" (اپنی خلوتوں میں خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں)۔ (شیخ کلینی، الکافی، ج۲، ص۵۰۰)۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا: «مَنْ أَكْثَرَ ذِكْرَ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ أَظَلَّهُ اللَّهُ فِي جَنَّتِهِ»؛ "جو خدا کا زیادہ ذکر کرے گا، وہ جنت میں خدا کے (فضل و کرم و رحمت کے) خاص سایہ میں رہے گا"۔ (شیخ کلینی، الکافی، ج۲، ص۵۰۰)۔

اس کے علاوہ شیخ کلینی نے کتاب الکافی میں پورا ایک باب اسی عنوان سے قائم کیا ہے: «بَابُ أَنَّ الصَّاعِقَةَ لَا تُصِيبُ ذَاكِراً»؛ خدا کا ذکر کرنے والے پر صاعقہ اور بجلی کبھی بھی نہیں گر سکتی؛ انہوں نے اس باب میں متعدد حدیثیں اس سلسلے میں ذکر کی ہیں؛ جن میں سے حضرت امام صادقؑ سے منقول ایک حدیث اس طرح آئی ہے کہ: «يَمُوتُ الْمُؤْمِنُ بِكُلِّ مِيتَةٍ إِلَّا الصَّاعِقَةَ- لَا تَأْخُذُهُ وَ هُوَ يَذْكُرُ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ»؛ "مومن ہر طرح کی موت سے مر سکتا ہے سوائے بجلی (کی موت) کے؛ جب وہ اللہ کے ذکر کی حالت میں ہو تو اس پر بجلی آ ہی نہیں سکتی" (یعنی اس پر

بجلی اثر ہی نہیں کر سکتی)۔(شیخ کلینی، الکافی، ج۲، ص۵۰۰)۔

۱۰-دنیا کی بہترین شئی

حضرت امام صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

«فَوَ اللهِ لَوْ كَانَ شَيْئاً أَفْضَلُ مِنْهُ لَعَلَّمَهُ رَسُولُ اللهِ ص إِيَّاهَا»؛ "خدا کی قسم! اگر اس تسبیح سے برتر اور افضل کوئی اور چیز ہوتی تو رسول خداؐ یقیناً اسی چیز کی تعلیم حضرت فاطمہ زہراؑ کو دیتے" (شیخ طوسی، تہذیب الاحکام، ج۳، ص۶۷)۔

اس روایت کا ذکر تسبیح فاطمہ زہراؑ کی کیفیت اور صحیح طریقہ کے حوالے سے مختصر وضاحت کے ساتھ گذر چکا ہے۔

۱۱-ذاکرین کے زمرہ میں شمار

حضرت امام صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ باتَ عَلى تَسْبِيحِ فاطِمَةَ عليها السلام كانَ مِنَ -الذّاكِرِينَ اللهَ كَثِيراً وَ الذّاكِراتِ»؛ "جو مرد یا عورت تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ پڑھ کر سوئے، ان کا شمار خدا کا بہت زیادہ ذکر کرنے والے مردوں اور اس کا بہت زیادہ ذکر کرنے والی عورتوں میں ہوگا" (فضل بن حسن طبرسی، تفسیر مجمع البیان، ج۸، ص۵۶۱)۔

۱۲-جسمانی بیماریوں کا علاج

تسبیح فاطمہ زہراؑ جس طرح انسان کی بہت سی روحانی اور باطنی بیماریوں کا علاج ہے؛ اسی طرح بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تسبیح انسان کی بہت سی جسمانی اور ظاہری بیماریوں کے علاج میں بھی موثر ہے؛ جیسا کہ ایک روایت میں وارد ہوا ہے کہ ایک شخص کو کان میں سنگینی کی شکایت تھی (یعنی اسے اونچا سننے کی بیماری تھی)؛ ایک مرتبہ وہ امام صادقؑ کی خدمت میں آیا، امام نے اس سے کچھ باتیں کہیں جسے وہ کامل طور پہ سن نہیں پایا اور اس کے بعد وہ اپنی اس بیماری کے بارے میں امام سے شکایت کرنے لگا، جس کے بعد امام صادقؑ نے اس سے ارشاد فرمایا:

«مَا يَمْنَعُكَ وَ أَيْنَ أَنْتَ مِنْ تَسْبِيحِ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ»؛ "کس چیز نے تم کو تسبیح فاطمہ زہراؑ سے روک رکھا ہے؟ (تم تسبیح فاطمہ زہراؑ کیوں نہیں پڑھتے؟)۔

اس نے عرض کیا: میں قربان جاؤں آپ پر! تسبیح فاطمہ زہراؑ کیا ہے؟ (اور کس طرح پڑھی جاتی ہے؟)۔

امام نے اس سے ارشاد فرمایا:

«تُكَبِّرُ اَللَّهَ أَرْبَعاً وَ ثَلاَثِينَ وَ تُحَمِّدُ اَللَّهَ ثَلاَثاً وَ ثَلاَثِينَ وَ تُسَبِّحُ اَللَّهَ ثَلاَثاً وَ ثَلاَثِينَ تَمَامَ اَلْمِائَةِ»؛ ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ؛ اس طرح سے کہ ۱۰۰ کی عدد پوری ہو جائے۔

وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے اس عمل کو ابھی کچھ ہی مدت انجام دیا تھا کہ جس مشکل (اور کان کی بیماری) میں مبتلا تھا، وہ برطرف ہو گئی اور میں شفایاب ہو گیا (علی بن حسن بن فضل طبرسی، مشکاۃ الانوار فی غرر الأخبار، ج۱، ص ۲۷۸)۔

اس واقعہ اور اس روایت کو علامہ مجلسی نے بحار الانوار (جلد ۸۲، صفحہ ۳۳۴) اور عبداللہ بحرانی اصفہانی نے عوالم العلوم (جلد ۱۱ صفحہ ۲۹۰) اور محدث نوری نے اپنی کتاب مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل (جلد ۵، صفحہ ۳۷) میں، اسی کتاب "مشکاۃ الانوار" کے حوالے کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۱۳-جان و مال کی حفاظت

امام صادقؑ خود اس واقعہ کے ناقل ہیں کہ دو بھائی رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ ہم دونوں تجارت کی غرض سے شام جانے کا ارادہ رکھتے ہیں آپ ہم دونوں کو کچھ تعلیم فرمایئے. آپؐ نے فرمایا:

«نَعَمْ، إِذَا أَوَيْتُمَا إِلَى الْمَنْزِلِ فَصَلِّيَا الْعِشَاءَ الْآخِرَةَ، فَإِذَا وَضَعَ أَحَدُكُمَا جَنْبَهُ عَلَى فِرَاشِهِ بَعْدَ الصَّلَاةِ فَلْيُسَبِّحْ تَسْبِيحَ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ(س)، ثُمَّ الْيَقْرَأْ آيَةَ الْكُرْسِيِّ، فَإِنَّهُ مَحْفُوظٌ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى يُصْبِحَ»؛" ٹھیک ہے جس جگہ پر تمہارا قیام ہے جب وہاں پلٹ کر واپس آؤ اور نماز عشاء سے فارغ ہو جاؤ اور سونے کا ارادہ کرو تو تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ پڑھو اور اس کے بعد آیت الکرسی کی تلاوت کرو؛ اگر (رات میں) یہ عمل انجام دے کر سوئے تو صبح تک تم لوگ ہر شے سے حفظ و امان میں رہو گے"۔

اس کے بعد امامؑ فرماتے ہیں کہ: "جب وہ دونوں شام پہنچے تو کچھ چوروں نے ان کا تعاقب کیا اور جب انہوں نے وہاں ایک منزل پر قیام کیا تو ان چوروں نے کسی کو جاسوسی کے لئے ان کے پاس بھیجا تاکہ وہ یہ پتہ لگائے کہ وہ دونوں کس حالت میں ہیں، جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں اور اس کے بعد انہیں باخبر کرے؛ وہ شخص آیا جبکہ وہ دونوں رسول خداؐ کے دستور کے مطابق تسبیح فاطمہؑ اور آیت الکرسی پڑھ کے بستر پہ سوئے تھے؛ وہ جاسوس جب ان دونوں بھائیوں کی سمت آیا تو اسے سوائے دو مضبوط دیواروں کے کچھ نظر نہیں آیا، کئی مرتبہ اس نے ان دیواروں کے آس پاس چکر لگایا لیکن اسے وہاں پر کوئی بھی شخص دکھائی نہیں دیا. پھر جب وہ پلٹ کر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور تفصیل بتائی تو انہیں یقین نہیں آیا، اسے جھٹلانے اور برا بھلا کہنے لگے؛ کہنے لگے کہ خدا تجھے ذلیل کرے! تو جھوٹ بول رہا ہے بلکہ تو بزدل ہے تو ان دونوں سے ڈر گیا ہے اور اس کے بعد وہ سب خود ان دونوں بھائیوں کی طرف گئے اور انہوں نے بھی بہت دقت اور غور سے ادھر ادھر دیکھا مگر انہیں بھی سوائے ان دیواروں کے کچھ اور نظر نہ آیا، نہ کوئی

انسان دکھائی دیا اور نہ کسی کی آواز سنائی دی. جس کے بعد وہ اپنے گھروں کو چلے گئے جب صبح ہوئی تو وہ سب ان دونوں کے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ کل رات تم لوگ کہاں ٹھہرے تھے کدھر سوئے تھے انہوں نے کہا کہ ہم تو یہیں پہ تھے اور یہاں سے باہر تک نہیں نکلے۔ ان لوگوں نے کہا خدا کی قسم! کل ہم لوگ یہاں آئے تھے مگر دیواروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ اب ہمیں بتاؤ کہ یہ پورا ماجرا کیا ہے، جس کے بعد دونوں بھائیوں نے اپنی پوری داستان بتائی کہ ہم اس سفر پر آنے سے پہلے رسول اللہؐ کی خدمت میں گئے تھے آنحضرتؐ نے ہم کو سونے سے پہلے آیت الکرسی اور تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ پڑھنے کی سفارش فرمائی جس کے توسط سے (آج) ہماری جان و مال کی حفاظت ہوئی"۔ (احمد بن محمد بن خالد برقی، المحاسن، ج۲، ص۳۶۸)۔

مذکورہ مطالب کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ تسبیح حضرت فاطمہؑ ایک بہترین عمل ہے اور پروردگار متعال کے ذکر کثیر کا کامل مصداق ہے۔ اور اس تسبیح کے سلسلے میں رسول خداؐ اور تمام معصومینؑ نے اپنے عمل اور اپنی فرمائشات کی روشنی میں بہت زیادہ تاکید فرمائی، اس کے طریقہ اور اس کے بہت سے آثار و برکات کا ذکر فرمایا۔ خداوند متعال کی بارگاہ میں بہ طفیل حضرت فاطمہ زہراؑ دعا ہے کہ ہم کو تعلیمات محمدؐ و آل محمدؐ پر چلنے، دیگر موجودات عالم کی طرح تسبیح الٰہی میں مصروف رہنے اور خاص کر تسبیح حضرت فاطمہ زہراؑ پر مداومت کرنے اور اس کی عظیم اور بے بدیل برکتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (**آمین یارب العالمین**)۔

اہم منابع و ماخذ

قرآن مجید

المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم۔ مفردات الفاظ القرآن۔ کتاب العین۔ لسان العرب۔ معانی الاخبار۔ البرہان فی تفسیر القرآن۔ کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ۔ المحتضر۔ علل الشرائع۔ من لایحضرہ الفقیہ۔ تفصیل وسائل الشیعۃ الی تحصیل مسائل الشریعۃ۔ المحاسن۔ تہذیب الاحکام۔ الکافی کلینی۔ ثواب الاعمال و عقاب الاعمال۔ تفسیر مجمع البیان۔ مشکاۃ الانوار فی غرر الاخبار۔ عوالم العلوم۔ مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل۔

حضرت فاطمہ زہراؑ؛ عالمین کے لئے اسوہ کاملہ

■ تحریر: مولانا کاشف رضا کلزار صاحب۔ مؤسس و بانی: اقراء علمی و ثقافتی مرکز
○ طالب علم جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم ایران

تمہید

اسلام کی تابناک تاریخ میں کچھ ایسی بر گزیدہ ہستیاں ابھرتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اپنے دور کے لئے بلکہ تمام انسانیت اور رہتی دنیا تک کے لئے مشعلِ ہدایت اور نمونہ عمل قرار دیا ہے۔ انہی آسمانی، نورانی ستاروں میں سے ایک، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی لختِ جگر، سیدۃ النساء العالمین، حضرت فاطمہ زہراؑ ہیں۔ آپؑ کی زندگی ایک ایسا آئینہ ہے جو ہر میدان میں کمال کی عکاسی کرتا ہے۔ چاہے وہ عبادت کی گہرائی ہو یا عائلی زندگی کی ہم آہنگی، علمی افق کی وسعت ہو یا سماجی و سیاسی جدوجہد کی بے مثال جرئت۔

اس مقالے میں ہم حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کی شخصیت کو شیعہ و سنی معتبر مآخذ کی روشنی میں، (البتہ بیشتر اہلسنت مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے) عالمین کے لئے ایک زندہ و جاوید نمونہ کے طور پر پیش کریں گے، تاکہ ان کی سیرت سے روشنی حاصل کرتے ہوئے ہم اپنی زندگیوں کو سنوار سکیں۔

۱۔ حضرت زہراؑ کی عظمت کا قرآنی بیان

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو اہل بیتؑ کی طہارت اور عظمت کو متعدد مقامات پر بیان کرتا ہے۔ ان آیات میں حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کی شخصیت کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے، جو ان کی عصمت و فضیلت کی گواہی دیتی ہیں۔

۱۔ آیۂ تطہیر: "اِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا"۔ (سورۂ الاحزاب، ۳۳)۔

صحیح مسلم (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث ۲۴۲۴) اور سنن ترمذی (سنن ترمذی، حدیث ۳۷۸۷) میں بیان ہے کہ یہ آیت رسول اللہ، حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین سلام اللہ علیہم کے بارے میں نازل ہوئی، جو اہل بیتؑ کی طہارت اور عصمت کو ثابت کرتی ہے۔

۲۔ آیۂ مباہلہ: "فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ"...(آل عمران، ۶۱)۔

اہل سنت کے مشہور مفسرین جیسے طبری نے اپنی تفسیر اور قرطبیؒ نے اپنی کتاب الجامع لاحکام

القرآن میں لکھا ہے کہ "نساءنا" سے مراد صرف حضرت فاطمہ زہراؑ ہیں، جو آپؑ کی منفرد حیثیت، عظمت و رفعت کو اجاگر کرتی ہے۔

۳۔ سورۂ دہر: متعدد روایات کے مطابق جب حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے تین دن مسلسل روزہ رکھا اور ہر دن اپنا افطار مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیا، تو یہ آیات نازل ہوئیں: "وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا" (الانسان، ۸)؛ یہ شان نزول شیعہ و سنی دونوں مصادر میں مذکور ہے (تفسیر طبری اور الدر المنثور للسیوطی)۔

۲۔ رسول اکرمؐ کے ارشادات میں حضرت زہراءؑ

رسول خداؐ نے اپنی حیات طیبہ میں بارہا حضرت فاطمہ زہراؑ کی عظمت کو بیان فرمایا اور ان کے کردار کو امت کے لئے ایک ابدی معیار قرار دیا۔ یہ ارشادات آپؑ کی فضیلت کے ایسے موتی ہیں جو ہمیشہ چمکتے رہیں گے۔ چند مشہور احادیث یہ ہیں:

خوشنودی فاطمہؑ کی عظمت

فاطمہ میرا ٹکڑا ہے اللہ فاطمہؑ کی رضا سے راضی اور فاطمہ کے غضب سے غضبناک ہوتا ہے؛ "**فاطمة بضعة مني، يرضى الله لرضاها ويغضب لغضبها**"۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث ۳۷۱۴؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث ۲۴۴۹) یہ حدیث آپؑ کی رضا اللہ کی رضا اور آپ کا غضب اللہ کا غضب بیان کرتی ہے۔ جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

جنت میں چار افضل خواتین

"**افضل نساء اهل الجنة اربع: مريم بنت عمران، فاطمه بنت محمد، خديجة بن خويلد و آسية امراة فرعون**"۔ اس حدیث میں چار خاتون کو جنت میں سب سے افضل قرار دیا گیا ہے جن میں حضرت فاطمہ زہراؑ بھی شامل ہیں، تاریخ نویسوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ ان میں سب سے افضل و برتر جناب سیدہؑ ہیں (مسند احمد بن حنبل، ح ۲۶۶۳؛ مستدرک حاکم، ح ۴۷۴۰)۔

جنتی خواتین کی سرور و سردار

"**قال رسول الله (ص): سيّدَةُ نِساءِ أَهْلِ الجَنَّةِ فاطِمَة**"۔ رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ: جنت کی تمام عورتوں کی سرور و سردار فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں (صحیح البخاری، کتاب الفضائل، باب مناقب فاطمۃ)۔

اسی طرح نقل ہوا ہے کہ "**قال رسول الله (ص): فاطِمَة سيّدةُ نِساءِ أَهْلِ الجَنّة**"۔ رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ: میری بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا جنت کی عورتوں کی سید و سردار ہے (صحیح البخاری، ج ۳، کتاب الفضائل باب مناقب فاطِمَۃ ص ۱۳۷۴؛ سنن الترمذی، ج ۳، ص ۲۲۶)۔

تمام عورتوں کی سرور وسردار

"قال رسول اللہ(ص): فاطِمَة سیِّدَةُ نِساءِ أُمَّتِي"۔ رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ: فاطمہؑ میری امت کی تمام عورتوں کی سردار ہیں(صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب مناقب فاطمۃ)۔

"قال رسول اللہ(ص):"حَسْبُک مِنْ نساءِ العالَمِین أَرْبَع: مَرْیمَ وَ آسیَة وَخَدیجَة وَفاطِمَة"۔ رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ: تمام جہانوں میں فقط چار عورتیں بہترین ہیں، مریمؑ، آسیہؑ، خدیجہ اور فاطمہؑ (مستدرک الصحیحین ج ۳ ، باب مناقب فاطمۃؑ، ص۱۷۱)۔

"قال رسول اللہ(ص): خَیرُ نِساءِ العالَمین أَرْبَع: مَرْیَم وَآسیة وَخَدِیجَة وَفاطِمَة"۔ رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ: جہان کی تمام عورتوں میں بہترین چار خواتین ہیں، مریمؑ، آسیہؑ، خدیجہ اور فاطمہ سلام اللہ علیہا(الجامع الصغیر، ج۱، ح ۴۱۱۲، ص ۴۶۹؛ الاِصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ج۴، ص۳۷۸)۔

آپ کے فضائل و مناقب کا احصاء ناممکن ہے یہ دریائے فضائل کے کچھ موتی، مونگ ہیں جنہیں آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ورنہ آپ کی ذات والا صفات انسانی ادراک سے بالاتر ہے۔

عبادت وروحانیت کی معراج

حضرت زہراءؑ زندگی عبادت کی ایک ایسی شمع تھیں جو راتوں کی تاریکی میں بھی روشنی پھیلاتی رہی۔ آپؑ طویل قیام و سجود میں راتیں گزارتیں اور اپنی دعاؤں میں دوسروں کو خود پر مقدم رکھتیں، جو ایثار کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

شیخ صدوقؒ کی "علل الشرائع" اور ابن سعد کی "الطبقات الکبریٰ" میں حضرت امام حسنؑ کا بیان ہے: "میں نے اپنی والدہ کو ہر رات نماز میں مشغول پایا اور انہیں ہمیشہ دوسروں کے لئے دعا کرتے دیکھا"۔

اسی طرح "تسبیح فاطمہؑ"، جو آج بھی امت میں رائج ہے، جو آپ کی عبادت کی زندہ علامت ہے۔ قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ وافراد جو آپ کی فضیلت میں اگر اور لیکن کرتے ہیں وہ بھی دن بھر اس تسبیح کا راگ الاپتے ہیں۔ یہ تسبیح ۳۴ مرتبہ "اللہ اکبر"، ۳۳ مرتبہ "الحمد للہ"، اور ۳۳ مرتبہ "سبحان اللہ" پر مشتمل ہے، جسے خود رسول اللہؐ نے تعلیم فرمایا۔(صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، حدیث ۲۷۲۷؛ الکافی، کتاب الصلاۃ)۔

علم وحکمت کی روشنی

حضرت زہراءؑ کا علمی مقام ایسا بلند ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آپؑ کے خطبات، بالخصوص "خطبۂ فدکیہ"، (جو مختلف کتابوں میں نقل ہوا ہے) قرآن، تاریخ اور فقہ کے ایسے اصولوں کا خزانہ ہیں جو آج بھی اہل علم کے لئے روشنی کا منبع ہیں۔

ابن طیفور کی "بلاغات النساء" میں یہ خطبہ نقل ہوا ہے، جس میں آپؑ نے نہ صرف ارثِ فدک کا حق

طلب کیا بلکہ اسلام کے بنیادی اصولوں، توحید، نبوت، عدل اور امامت کو نہایت بلیغ، مستدل اور دل نشین انداز میں بیان فرمایا۔ آپؑ نے قرآن سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا: "وَ وَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ" (النمل، ۱۶) جو انبیاء کی وراثت کی تصدیق کرتی ہے۔ آپ نے قرآن سے استدلال کر کے یہ بتادیا کہ حسبنا کتاب اللہ کے دعویداروں کا نہ قرآن سے کچھ لینا دینا اور نہ رسول اسلامؐ سے، ساتھ ہی ساتھ غاصبان فدک اور خلافت کے جھوٹے دعویداروں کے چہروں سے منافقت کی نقاب اتار پھینکی اور ان کا اصلی چہرہ دنیای عدالت کے سامنے پیش کیا کہ نہ یہ مسلمان ہیں اور نہ ان کے اندر اسلام ہے، تو کہاں سے رسول اسلام (ص) کے خلیفہ ہوں گے۔

عائلی زندگی اور گھریلو کردار

حضرت فاطمہؑ کی ازدواجی زندگی ہر مسلمان خاتون کے لئے ایک تابناک نمونہ ہے۔ صعوبات ومشکلات کے باوجود آپؑ نے صبر و قناعت کو اپنایا اور حضرت علیؑ کے ساتھ وفاداری اور تعاون کی ایسی مثال قائم کی جو تاریخ کی زینت ہے۔

ابن سعد کی "الطبقات الکبریٰ" اور مسند احمد میں امیر المؤمنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: "فاطمہؑ نے کبھی مجھے ناراض نہ کیا اور نہ میں نے انہیں کبھی ناراض کیا"۔

آپؑ نے بچوں کی تربیت میں کمال حاصل کیا۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ جیسی ہستیاں آپؑ کی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھیں، جو امت کے لئے ابدی روشنی ہیں۔

سماجی وسیاسی کردار

رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد امت کی بے وفائی اور بد عہدی کسی سے پوشیدہ نہیں؛ جہاں نام نہاد صحابہ نے آل محمدؐ کو تنہا چھوڑ دیا۔ مدینہ وہ پہلی اور آخری جگہ ہے جہاں فاطمہؑ، علیؑ، حسنؑ، حسینؑ...؛ صحابہ رسول کے ہوتے ہوئے بھی تنہا تھے۔ مگر اس پر آشوب ماحول میں بھی حضرت زہراؑ نے محمدی کردار اپناتے ہوئے فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور حق کی حمایت میں آواز بلند کی اور غاصبان خلافت و فدک کے سامنے مسجد نبوی میں تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اسلام کے اصولوں اور اجتماعی عدل پر زور دیتے ہوئے دنیا کو سمجھادیا کہ کون عادل ہے اور کون غاصب اور دنیا کے سامنے ظالمین اور غاصبین کا واقعی چہرہ اجاگر کردیا کہ ان کے پیروکاروں سے چھپائے نہیں چھپتا۔ یہ خطبہ اہل بیتؑ کے حقوق کے دفاع کے ساتھ ساتھ امت کو بیدار کرنے اور اسلام کی اصل روح کو محفوظ رکھنے کا شاہکار ہے (بلاغات النساء، ابن طیفور؛ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید)۔ اور تشیع کی حقانیت پر بیّن دلیل بھی۔

۳۔ حضرت زہراءؑ بطور اسوہ کاملہ

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی زندگی ہر طبقے کے لئے ایک مکمل نمونہ ہے:

- مردوں کے لئے: حق کی حمایت اور دین پر استقامت کی مثال۔
- خواتین کے لئے: عفت، حیا، صبر اور ایثار کی تجسیم۔
- جوانوں کے لئے: حیا، عزیمت اور خدمتِ دین کی ترغیب۔
- پوری امت کے لئے: ولایت کی حفاظت اور حق و باطل میں امتیاز کی تعلیم۔

یہ سیرت ایک ایسا دریا ہے جو ہر دل کو سیراب کرتا ہے۔

نتیجہ

حضرت فاطمہ زہراءؑ کی زندگی ایک مکمل اسوہ ہے جو قیامت تک آنے والے ہر انسان کے لئے مشعلِ راہ رہے گی۔ آپؑ کی عبادت و زہد، علم و حکمت، عائلی و سماجی زندگی اور حق کے دفاع میں استقامت امت کو یہ پیغام دیتی ہے کہ حقیقی کامیابی اسی راہ پر ہے جو حضرت زہراءؑ کی سیرت سے منور ہے۔ اللہ ہمیں آپؑ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

مصادر و مراجع

صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابہ؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ؛ مسند احمد بن حنبل؛ مستدرک حاکم نیشاپوری؛ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد؛ الدر المنثور، جلال الدین سیوطی؛ تفسیر طبری، امام طبری؛ الجامع لاحکام القرآن، امام قرطبیؒ؛ بلاغات النساء، ابن طیفور؛ علل الشرائع، شیخ صدوق؛ سنن ترمذی، کتاب المناقب؛ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید؛ الجامع الصغیر؛ الاصابۃ فی تمییز الصحابہ۔

امام زین العابدین ؑ کا بہترین طرز زندگی

▪ تحریر: مولانا محمد علی صاحب۔
○ طالب علم جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم ایران

امام زین العابدین ؑ کی ولادت باسعادت

مؤرخین اور سیرت نگاروں کے درمیان امام علی بن الحسین (علیہ السلام) کی پیدائش کی تاریخ پر اختلافِ نظر ہے۔ بعض نے پانچویں شعبان، بعض نے ساتویں، بعض نے نویں شعبان اور بعض نے جمادی الاول کی پندرہویں تاریخ کو آپ کی ولادت کا دن قرار دیا ہے۔ شیخ مفید نے کتاب "مسار الشیعہ" میں جمادی الاول کی پندرہویں تاریخ کو آپ کی پیدائش کا دن بتایا ہے اور اس دن کی عظمت و بزرگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«و هو يومٌ شريفٌ، يُستحبُّ فيه الصيامُ و التطوّعُ بالخيرات» (یعنی یہ ایک مقدس دن ہے، جس میں روزہ رکھنا اور نیکیوں کا تبرّع کرنا مستحب ہے)۔

اسی طرح بعض مؤرخین نے آپ کی پیدائش کا سال ۳۸ ہجری، بعض نے ۳۶ ہجری اور بعض دیگر نے ۳۷ ہجری قمری لکھا ہے۔ (مناقب آل ابی طالبؑ، ابن شہر آشوب، ج ۳، ص ۳۱۰؛ وصول الاخبار، بہایی عاملی)، ص ۴۲؛ بحار الانوار، علامہ مجلسی، ج ۶۴، ص ۱۲؛ منتہی الآمال، شیخ عباس قمی، ج ۲، ص ۱)۔ تاہم شیعہ کے درمیان مشہور و معروف رائے یہ ہے کہ آپ کی ولادت ۵ شعبان ۳۸ ہجری کو ہوئی۔

حضرت امام سجادؑ کی پیدائش کی جگہ کے بارے میں بھی اکثر شیعہ علماء، مدینہ کو آپ کی ولادت گاہ سمجھتے ہیں۔ (مسند الامام السجادؑ، ج ۱، ص ۸-۵) لیکن شیخ باقر شریف قرشی کا خیال ہے کہ آپ کی پیدائش کوفہ میں ہوئی تھی، اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سجادؑ کی پیدائش آپ کے دادا حضرت علیؑ کے دورِ حکومت میں ہوئی تھی، اور اس زمانے میں امام حسینؑ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ کوفہ میں رہائش پذیر تھے۔ (تحلیلی از زندگانی امام سجاد علیہ السلام، ج ۱، ص ۵۳)۔

آپ کے والد ماجد امام حسینؑ اور والدہ ماجدہ حضرت شہر بانو تھیں، جو ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی بیٹی تھیں (الارشاد، شیخ مفید، ص ۴۹۲؛ منتہی الآمال، ج ۲، ص ۳)۔ اسی طرح آپ کا نسب رسول اللہؐ سے بھی ہے۔ آپ شیعوں کے

چوتھے امام ہیں۔آپ کا نام علیؑ بن الحسینؑ، کنیت ابو محمد اور مشہور القابات زین العابدین (عبادت گزاروں کی زینت) اور سید الساجدین (سجدہ کرنے والوں کے سردار) ہیں۔آپ نے اپنی زندگی کے ۳۵ سال امامت کے فرائض انجام دیئے۔

واقعہ کربلا میں شدید بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہ لے سکے، لیکن اس کے بعد آپ کو اسیر بنا کر کوفہ اور شام لے جایا گیا، جہاں آپ کے خطبات نے اہل بیتؑ کے مقام و منزلت کو لوگوں پر واضح کیا۔یہ مختصر سا آپ کا تعارف تھا۔

آپؑ کا طرز زندگی حضرت رسول خداؐ کے چوتھے جانشین اور چوتھے امام ہونے کی وجہ سے ہم سب کے لئے حجت اور نمونہ عمل ہے۔

اگر آپؑ کی زندگی کے بارے میں مفصل تحریر کیا جائے تو بہت سی کتابوں کی درکار ہوگی لیکن یہاں اس مختصر مضمون میں آپ کی زندگی کے کچھ اہم پہلوؤں کا ذکر کیا جارہا ہے:

الف: آپ کا طرز زندگی خدا کے ساتھ

حضرت امام زین العابدینؑ کے طرز زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت آپ نے معرفت خدا اور عبادت خدا کے ساتھ بہترین زندگی گزاری اور اپنے عمل اور اپنے اقوال و احادیث، خاص طور پر دعاؤں کی شکل میں چاہنے والوں کے لئے بہترین سرمایہ چھوڑا۔

۱۔خدا کی معرفت

حضرت امام سجادؑ کی معرفت اور عبادت کا اندازہ آپ کی دعاؤں کے مجموعہ صحیفہ سجادیہ سے معلوم ہوتا ہے۔یہ دعاؤں اور مناجات کا عظیم مجموعہ ہے۔ یہ دعاؤں کا مجموعہ امام سجادؑ کے عرفانی، معرفتی اور روحانی افکار کا روشن آئینہ ہے۔اسی وجہ سے اسے "زبورِ آلِ محمدؐ" بھی کہا جاتا ہے۔جو شخص اس صحیفہ کا مطالعہ کرے، وہ امام سجادؑ کی بامقصد، آگاہانہ اور عمیق عبادت کی عظمت کو محسوس کر سکتا ہے۔

اسی طرح رسالہ حقوق بھی ہے جس میں آپ نے لوگوں کے آپسی حقوق اور بندوں پر خدا کے حقوق کا ذکر فرمایا ہے۔یہاں وہ حقوق جن کے طرف تمام بندگان خدا کو متوجہ رہنا چاہئے ان کا ذکر کیا جارہا ہے۔ ان حقوق کے مطالعہ سے امام سجادؑ کی عظیم معرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔امام فرماتے ہیں:

"سب سے بڑا حق جو تم پر رکھا گیا ہے، وہ اللہ کا حق ہے۔لازم ہے کہ تم اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔اگر تم یہ عمل انجام دو تو خداوند سبحان اس بات کا ذمہ دار ہے کہ تمہارے دنیاوی اور اخروی تمام امور کو سنبھال لے"۔

یہ بات ایک جملے میں کہی گئی ہے لیکن اس کا مفہوم لامحدود ہے۔اگر بندہ شایستگی و صلاحیت پیدا کرے اور ریاکاری اور دکھاوے سے پاک نیت کے

ساتھ خدا کی عبادت کرے تو خدائے علیم و قدیر اس کی پوری زندگی کی کفالت فرماتا ہے اور آخرت میں بھی اس کا انجام بھلائی اور سعادت پر ہوگا"۔ (احمدی، حبیب اللہ، امام سجاد الگوی زندگی، نشر قم فاطمیا، سال ۱۳۸۲، ص ۱۴۲)۔

۲۔ کثرت عبادت

حضرت امام سجادؑ کثرت عبادت کے لئے معروف و مشہور تھے، آپؑ کو "زین العابدین" اور "سید الساجدین" کے القابات بھی اسی وجہ سے ملے تھ۔ آپ کی عبادت کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ آپ کے ہاتھ، گھٹنے اور پیشانی پر سجدوں کے نشان (ثفنات) پڑ گئے تھے، جو اونٹ کے گھٹنوں پر پڑنے والے نشانات سے مشابہ تھے۔آپ "زین العابدین" (عبادت کرنے والوں کی زینت) اور "سجاد" (بہت زیادہ سجدہ کرنے والے) کے لقب سے معروف تھے، آپ ایک خالص اور نیک بندۂ خدا تھے۔آپ کے لمبے سجدوں کو دیکھ کر ہر دیکھنے والا خود بخود خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے "حدیثِ لوح"— جو خدا کی طرف سے حضرت محمد مصطفیٰؐ کے لیے ایک خصوصی پیغام ہے اس میں آپ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ: "سید العابدین و زین أولیائی الماضین"؛ "وہ میرے عبادت گزار بندوں کے سردار اور میرے گزشتہ اولیاء کی زینت ہیں"۔

یوسف بن اسباط کہتے ہیں:

میرے والد نے کہا کہ ایک رات میں آدھی رات کے وقت مسجد گیا، میں نے ایک جوان کو دیکھا جو سجدے میں گرا ہوا تھا اور خدا سے اس طرح راز و نیاز کر رہا تھا:

"سجد وجهي متعفراً في التراب لخالقي و حق له"؛ "میرا چہرہ مٹی میں جھکا ہوا ہے، میں اپنے خالق کے لیے سجدہ ریز ہوں، اور وہی سجدے کا سچا حقدار ہے"۔

میں قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہ جوان کوئی عام شخص نہیں بلکہ امام زین العابدینؑ ہیں۔

میں صبر کرتا رہا یہاں تک کہ صبح کا اجالا پھیل گیا۔ پھر میں اُن (امام زین العابدینؑ) کے پاس گیا اور عرض کیا:

"اے رسولِ خداؐ کے فرزند! آپ اپنے آپ کو اتنی مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں؟ حالانکہ خدا نے آپ کو برتری عطا کی ہے اور آپ کا مقام خدا کے حضور بہت بلند ہے"۔

جب انہوں نے یہ بات سنی تو ان کا دل بھر آیا، وہ رو پڑے اور فرمایا کہ حضرت محمدؐ کا ارشاد گرامی ہے:

"جب قیامت کا دن قائم ہوگا تو ہر آنکھ رو رہی ہوگی سوائے چار آنکھوں کے: ۱۔ وہ آنکھ جو خوفِ خدا سے روئی ہو۔ ۲۔ وہ آنکھ جو اللہ کی راہ میں (جہاد میں) نابینا ہو گئی ہو۔ ۳۔ وہ آنکھ جو حرام چیزوں سے بچ کر بند رہی ہو۔ ۴۔ وہ آنکھ جو رات بھر سجدے میں بیدار رہی ہو (بحارالانوار، ج ۴۶، ص ۹۹، ح ۸۸)۔

امام سجاد علیہ السلام کی عبادت ایک بامقصد، عمیق اور باشعور عبادت تھی۔ آپ خدا کی عبادت نہ صرف خشوع کے ساتھ بلکہ شوق، محبت اور مکمل معرفت کے ساتھ کرتے تھے۔

آپ کا خدا سے تعلق ایسا گہرا اور زندہ تھا کہ روایت میں بیان ہوا ہے:

ایک رات آپ عبادت کے لیے اٹھے، وضو کرتے ہوئے آسمان کے ستاروں پر آپ کی نگاہ پڑی۔ آپ انہیں دیکھتے ہی دیکھتے خالق اور اس کی تخلیق کے بارے میں گہرے غور و فکر میں ڈوب گئے۔ آپ حیران اور مبہوت رہ گئے... اسی حالت میں ہاتھ میں پانی میں تھا اور نگاہیں آسمان کی طرف جمی ہوئی تھیں، یہاں تک کہ فجر کی اذان کی آواز سنائی دی۔

فاطمہ بنت علیؑ، جو امام علیؑ کی بیٹی تھیں انہوں نے جابر بن عبداللہ انصاری سے درخواست کی کہ وہ امام سجادؑ کے پاس جائیں اور دلسوزی کے ساتھ ان سے کہیں کہ اپنی جان کو اتنی سخت عبادتوں سے بچائیں۔ کیونکہ امامؑ کثرتِ عبادت کے باعث اپنی ناک، پیشانی، ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور گھٹنوں پر شدید زخموں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جابر امامؑ کے پاس گئے اور ان سے عرض کیا کہ آپ اپنے آپ کو اتنی سخت مشقت اور عبادت کے بوجھ سے بچائیں، کیونکہ یہ تکلیف بہت سخت اور ناقابلِ برداشت ہے۔

امام سجادؑ نے ان کی بات سنی اور فرمایا:

اے رسولِ خداؐ کے ہمنشین! میرے جد حضرت محمدؐ اس قدر عبادت کیا کرتے تھے کہ آنحضرتؐ کے پاؤں سوج جاتے تھے۔ کسی نے آنحضرتؐ سے عرض کیا: آپ خود کو اتنی مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: «افلا اکون عبداً شکورا»؛ کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟۔

جابر نے عرض کیا: آپ کی قیمتی جان خطرے میں ہے، آپ اپنے اوپر اتنا دباؤ نہ ڈالیں۔

اس پر امام زین العابدینؑ نے فرمایا:

«یا جابر لا ازال علي منهاج ابوي موتسياً بهما حتي القاهما»؛ اے جابر! میں ہمیشہ اپنے آباو اجداد (یعنی رسولِ خداؐ اور امام علیؑ) کے راستے پر چلتا رہوں گا، انہی کو اپنا نمونہ بناؤں گا، یہاں تک کہ اُن سے جا ملوں گا۔ (مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۱۴۸)۔

ب: آپ کا طرز زندگی دوستوں کے ساتھ

کربلا سے واپسی کے بعد مدینہ کے حالات بہت پر آشوب تھے ،ان حالات میں لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا بہت سخت تھا پھر بھی تاریخ میں حضرت امام سجادؑ کے نیک سلوک اور دوسروں کے ساتھ اچھے برتاؤ کے بہت سی مثالیں بیان ہوئی ہیں۔ یہاں کچھ اہم واقعات اور مثالوں کا ذکر کیا جارہا ہے:

ا۔ دوستوں کے ساتھ نیک برتاؤ

حضرت امام سجادؑ اپنے اصحاب کے ساتھ کریمانہ اور دلسوزانہ برتاؤ رکھتے تھے۔ آپ کا برتاؤ صداقت، محبت اور سخاوت کی کامل مثال تھا اور حلم، بردباری اور جوانمردی میں آپ دنیا والوں کے لئے نمونہ عمل ہیں۔

آپ کا ان دوستوں کے ساتھ برتاؤ کہ جن کا ثقافتی اور معاشرتی مقام بلند تھا، اس میں کوئی بحث نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ تو ہر کوئی شایستہ برتاؤ کرتا ہے؛ لیکن جو چیز اہم نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آپ نے ان دوستوں کے ساتھ کس طرح پیش آیا جو کسی بھی وجہ سے معاشرے کے نچلے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے؟

ذیل کی مثالیں آپ کے محروم دوستوں اور بے بس غریبوں کے ساتھ برتاؤ کی نوعیت کو واضح کر سکتی ہیں:

طاؤس یمانی کہتے ہیں:

"ایک بار جب ہم حج کے سفر میں تھے، مقام "صفا" پر ہم نے ایک نہایت ہی باوقار اور عظمت والے نوجوان کو دیکھا، جو کمزور اور لاغر جسم کے تھے اور ان کے جسم پر مناسب کپڑے نہیں تھے۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

"میں ننگا ہوں جیسا کہ تو دیکھ رہا ہے، بھوکا ہوں جیسا کہ تو دیکھ رہا ہے، پھر تو جو کچھ دیکھ رہا ہے اس میں کیا دیکھ رہا ہے؟ اے وہ جو دیکھتا ہے اور خود نہیں دیکھا جاتا"۔

اس ناشناس شخص کی خدا سے بات سن کر میں لرز گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک طبق (پلیٹ) اتری جس میں دو یمنی چادریں تھیں۔ اس وقت حضرت امام سجادؑ نے محبت بھری نظر سے میری طرف دیکھا اور فرمایا: اے طاؤس!

میں نے کہا: جی مولا

یہ دیکھ کر میری حیرت اور بڑھ گئی کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا حالانکہ میں نے انہیں پہچانا نہیں تھا۔ پھر انہوں نے فرمایا: کیا تمہیں بھی اس طبق میں سے کوئی چیز چاہیے؟

اور انہوں نے طبق سے پردہ ہٹا دیا۔ طبق میں کپڑوں کے علاوہ خراسان کی کچھ مٹھائیاں بھی تھیں۔ میں نے عرض کیا: اے میرے آقا! مجھے چادر یا

کپڑے کی ضرورت نہیں، لیکن جو کچھ اس طبق میں ہے اس میں سے تھوڑا سا مجھے عطا فرما دیجیے۔

انہوں نے مجھے ایک مٹھی بھر کر دی۔ میں نے ان کا ہاتھ چوما اور ان مٹھائیوں کو اپنے احرام کے دامن سے باندھ لیا اور تھوڑی سی کھائی۔ میں نے اس ذائقہ اور لذت کی کوئی چیز پہلے نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی کھائی تھی۔

پھر اس ناشناس شخص نے طبق سے دو چادریں اٹھائیں، ایک کو لنگوٹ کے طور پر اور دوسری کو احرام کی چادر کے طور پر پہن لیا، اور جو کپڑے ان کے جسم پر تھے وہ مستحق افراد کو دے دیے۔

ہم وہاں سے چل پڑے یہاں تک کہ "مروہ" پہنچ گئے۔ وہاں لوگوں کے ہجوم نے انہیں میری نظر سے اوجھل کر دیا اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ کیا وہ فرشتہ تھا یا خدا کے اولیاء میں سے کوئی؟ اچانک ایک آواز آئی اور کہنے لگی:

"اے طاؤس! تم پر افسوس! کیا تم نے اپنے زمانے کے امام کو نہیں پہچانا؟ وہ جن و انس کے امام ہیں۔ وہ امام الساجدینؑ اور زین العابدینؑ ہیں"۔

اس کے بعد میں تیزی سے حضرتؑ کے پیچھے بھاگا یہاں تک کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ پھر میں ان سے جدا نہیں ہوا یہاں تک کہ مجھے دنیا اور آخرت کے بہت سے فوائد ان سے حاصل ہوئے۔" (معاجز الولایۃ، کاظمینی بروجردی، ص ۱۷۵)۔

ایک اور واقعہ ہے کہ جو زہری سے منقول ہے کہ ایک سرد اور برفانی رات میں، میں نے امام سجادؑ کو دیکھا کہ وہ اپنے کندھے پر آٹے کا تھیلا اور لکڑیوں کا گٹھر اٹھائے ہوئے تھے۔ (مناقب آل ابی طالبؑ، ابن شہر آشوب، انتشارات علامہ قم، ۱۳۷۹، ج ۴، ص ۱۵۴)۔

۲۔ ساتھیوں کا ادب واحترام

امام سجادؑ کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ برتاؤ اسلامی آداب کی بلندی اور عظیم اخلاقی خوبیوں کا بہترین نمونہ تھا۔ آپ تمام ساتھیوں کا احترام کرتے اور ان کی عزت کرتے تھے، جیسا کہ خود آپ نے فرمایا:

"میرے پاس جو بھی بیٹھا، میں نے ہمیشہ اس کی عزت کی"۔

امامؑ اپنے ساتھیوں کی بہت عزت کرتے، ان پر بڑے احسانات فرماتے اور اپنے عمدہ اخلاق کے ساتھ ان سے پیش آتے۔ ایک دن نضر بن اوس آپ کے پاس آئے، امامؑ نے ان کا خیر مقدم کیا اور فرمایا:

"آپ کس قبیلے سے ہیں؟"

"قبیلہ طی سے"

فرمایا: "آپ کا خیر مقدم ہو اور اس قوم کا بھی خیر مقدم ہو جس سے آپ تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کا قبیلہ بہت اچھا قبیلہ ہے!"

اس طائی شخص نے امام کی طرف دیکھ کر کہا:

"براہ کرم اپنا تعارف کرائیں؟"

"میں علیؑ بن حسینؑ ہوں"

"کیا علیؑ بن حسینؑ آپ کے والد گرامی کے ساتھ کربلا میں شہید نہیں ہوئے تھے؟"

امامؑ نے بڑی پیاری اور محبت بھری بات کہی:

"اگر وہ شہید ہو گئے ہوتے تو تم انہیں اب یہاں نہ دیکھ رہے ہوتے!"

تاریخ دان بیان کرتے ہیں:

امام سجادؑ کبھی بھی اپنے ساتھیوں کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ کسی ایسے شخص کے خلاف جارحانہ رویہ اپنائیں جس نے آپ کے ساتھ برا سلوک کیا ہو۔ ایک دن آپ کے دشمنوں میں سے ایک شخص امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

"کیا آپ نماز سے واقف ہیں؟"

ابو حازم، جو امام کے اصحاب میں سے تھے، اس شخص کو ڈانٹنا چاہتے تھے، لیکن امامؑ نے انہیں روک دیا اور فرمایا:

"ابو حازم! رک جاؤ۔ بے شک علماء بردبار اور مہربان ہوتے ہیں۔"

پھر آپ نے اس شخص کی طرف رخ کرتے ہوئے محبت سے فرمایا:

"ہاں، میں نماز سے واقف ہوں۔"

اس شخص نے نماز سے متعلق کچھ سوالات پوچھے، امامؑ نے جواب دیا۔ وہ شخص شرمندہ ہوا اور معافی مانگنے لگا اور کہا کہ

"آپ نے سب پر حجت تمام کر دی۔"

(تحلیلی از زندگانی امام سجاد علیہ السلام، ج۱، ص۱۰۳)۔

بے شک، امامؑ کا اپنے ساتھیوں اور دوسروں کے ساتھ رویہ ان کے دادا، رسول گرامیؐ کے جیسا تھا، جو مکرم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

ج۔ ہمسایوں کے ساتھ مہربانی

امام زین العابدینؑ، ہر کسی سے زیادہ اپنے ہمسایوں پر مہربان تھے۔ آپ ہمیشہ ان کی اتنی خیر خواہی فرماتے جتنی اپنے اہلِ خانہ کی کرتے تھے۔ آپ ان کے غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری فرماتے، ان کے بیماروں کی عیادت کو جاتے، اور ان کے مردوں کے جنازے میں شریک ہوتے تھے۔ کوئی بھی قسم کی بھلائی ایسی نہ تھی جو آپ اپنے ہمسایوں کے ساتھ نہ کرتے ہوں۔

امام زین العابدینؑ، ہمسایوں کے ساتھ نیکی، احسان اور محبت پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ

ان کے لیے دعا بھی فرماتے تھے اور اللہ سے ان کے لیے توفیق، نیکی اور تقوا طلب کرتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے آپ اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے دعائیں فرماتے اور ان کے لئے اللہ سے بھلائیاں مانگتے تھے۔ اور بے شک ہمسایے امام کی توجہ کے مرکز تھے اور آپ نے اپنی دعاؤں میں خاص طور پر ان کی طرف توجہ فرماتے تھے اور ان کے لیے مندرجہ ذیل الفاظ میں دعا کرتے تھے:

"یا اللہ! محمدؐ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما، اور میرے ہمسایوں، میرے دوستوں اور ہمارے حق کو پہچاننے والوں اور ہمارے دشمنوں سے برات رکھنے والوں کے معاملے میں اپنی بہترین ولایت کے ساتھ میری مدد فرما، اور انہیں توفیق دے: تیری سنت قائم کرنے کی، اچھے آداب اختیار کرنے کی، کمزوروں کے ساتھ نرمی کرنے کی، ان کی ضروریات پوری کرنے کی، بیماروں کی عیادت کرنے کی، راہِ راست طلب کرنے والوں کی رہنمائی کی، مشورہ مانگنے والوں کی خیر خواہی کی، آنے والوں کی خبر گیری کرنے کی، ان کے رازوں کو محفوظ رکھنے کی، ان کے عیبوں کو ڈھانپنے کی، ان کے مظلوموں کی مدد کرنے کی، ضروریاتِ زندگی میں ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کی، ان پر تازہ احسان اور فضل کرتے رہنے کی، اور انہیں مانگنے سے پہلے ہی وہ دے دینے کی جو ان کا حق ہے۔ (صحیفہ سجادیہ: دعای ۲۶)۔

د۔ غلام اور کنیزوں پر احسان

امام زین العابدینؑ اپنے غلاموں کے ساتھ نرمی، محبت اور احسان کا برتاؤ کرتے تھے اور ان کے ساتھ اپنے بیٹوں جیسا سلوک رکھتے تھے۔ وہ انہیں اپنی نیکی، خیر خواہی اور احسان میں شامل رکھتے تھے، یہاں تک کہ آپ کی محبت کے سایہ میں انہیں اتنی نرمی اور محبت ملتی تھی کہ انہیں اپنے والد کے سایہ میں بھی میسر نہ تھا۔ (تحلیلی از زندگانی امام سجادؑ، ج۱، ص: ۹۶)

راویوں کا بیان ہے کہ آپ نے کبھی کسی کنیز یا غلام کو سزا نہیں دی، چاہے ان سے کوئی گناہ ہی سرزد کیوں نہ ہوا ہو۔

امامؑ کا ایک غلام تھا۔ ایک دن آپ نے اسے دو بار آواز دی، لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ تیسری بار امامؑ نے نرمی اور شفقت سے اس سے فرمایا:

"بیٹا! کیا تم نے میری آواز نہیں سنی؟"

اس نے جواب دیا: "کیوں نہیں، میں نے سنی تھی۔"

آپ نے فرمایا: "پھر تم نے جواب کیوں نہیں دیا؟"

غلام بولا: "کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں سزا سے محفوظ ہوں۔امامؑ یہ بات سن کر گھر سے باہر نکلے اور اللہ کا حمد و شکر بجالاتے ہوئے فرمانے لگے

"اللہ کا شکر ہے جس نے میرے غلام کو مجھ سے محفوظ کر دیا"۔(تاریخ دمشق، ص۱۵)۔

امامؑ اس بات پر خوش تھے کہ وہ سخت دل اور ظالم نہیں ہیں کہ لوگ آپؑ سے ڈریں یا ان سے بچ کر رہیں۔

ایک دن امام سجادؑ کی ایک کنیز آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہی تھی کہ اچانک برتن گر گیا اور آپ کے مبارک سر پر لگا، یہاں تک کہ سر زخمی ہو گیا۔آپ نے جب کنیز کی طرف رخ کیا تو وہ کنیز پریشان اور خوفزدہ ہوگئی اور عقلمندی سے اور غصہ کو پی جانے والی یہ آیت پڑھی:

«وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ»؛ (یعنی پرہیزگار غصہ پی جاتے ہیں)۔

امام نے فرمایا: میں نے اپنا غصہ پی لیا۔

کنیز نے آیت کا اگلا حصہ پڑھا:

«وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ»؛اور لوگوں سے درگزر کرنے والے" (یعنی پرہیزگار لوگوں کی خطاؤں کو معاف کرتے ہیں)۔

امامؑ نے فرمایا: میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

کنیز نے آیت کا اختتامی حصہ پڑھا:

«وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ»؛ "اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" (سورہ آل عمران، آیت ۱۳۴)۔

امام سجادؑ نے کنیز کے ساتھ احسان فرمایا اور کہا: "جاؤ، میں نے تمہیں اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا"۔ (الارشاد، شیخ مفید، ج۲، ص۱۴۶۔۱۴۷)

اس قسم کی بہت سی مثالیں تاریخی اور روایات کی کتابوں میں ذکر ہوئی ہیں جن کا ذکر یہاں مطالب کے طولانی ہونے کی وجہ سے نہیں کیا جارہا ہے۔

ھ۔ آپ کا حیوانوں کے ساتھ نیک سلوک

مذکورہ مطالب اور موارد وہ تھے جو مختلف انسانی گروہوں کے ساتھ امام سجادؑ کے شائستہ اور مناسب برتاؤ کے بارے میں تھے؛ جو مختلف شکلوں میں آپ کے ساتھ وابستہ تھے۔آپ کا ہمدردانہ رویہ اس وقت اور بھی حیرت انگیز لگتا ہے جب ہم آپ کا جانوروں کے ساتھ حسن سلوک دیکھتے ہیں۔آپ کا جانوروں کے ساتھ بہترین اور نیک سلوک، آپ کے ایمان، استقامت، خدا کے خوف اور آخرت کے عقیدے کی بلندی کی نشاندہی کرتا ہے۔

حضرت امام باقر علیہ السلام نے بیان کرتے ہیں کہ:

میں اور کچھ لوگ میرے والد امام سجادؑ کی موجودگی میں بیٹھے تھے کہ اچانک صحرا سے ایک ہرنی

آئی اور میرے والد کے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو کر رونے اور کچھ کہنے لگی۔

حاضرین نے میرے والد سے پوچھا: یہ کیا کہہ رہی ہے؟

والد نے فرمایا: کہہ رہی ہے کہ میرے بچے کو فلاں شخص نے پکڑ لیا ہے، کل سے اب تک اس نے دودھ نہیں پیا ہے، میں درخواست کرتی ہوں کہ اس سے لے کر میرے پاس لاؤ تاکہ میں اسے دودھ پلا سکوں۔

امام سجادؑ نے ایک شخص کو شکاری کے پاس بھیجا اور اسے پیغام دیا کہ وہ ہرن کے بچے کو لے آئے۔ جب وہ لے آیا، تو ہرن کی ماں نے اپنے بچے کو دیکھا، اس نے چند بار اپنے پیر زمین پر مارے اور ایک درد ناک اور غمگیں آہ بھری اور اپنے بچے کو دودھ پلایا۔

پھر امام سجادؑ نے شکاری سے درخواست کی کہ وہ ہرن کے بچے کو آزاد کر دے، شکاری نے مان گیا۔ امام نے بچے کو اس سے لیا اور اس کی ماں کے حوالے کر دیا، ہرن نے اپنی آواز سے کچھ کہا اور اپنے بچے کے ساتھ صحرا کی طرف چل دی۔

حاضرین نے امام سجادؑ سے پوچھا کہ ہرن نے کیا کہا؟ امام نے فرمایا:

"اس نے تمہارے لیے خدا کے حضور دعا کی اور نیک اجر مانگا"۔ (بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۳۰)۔

۷۔ دشمنوں کی ہدایت

کبھی کبھی دشمنوں کے زہریلے پروپیگنڈے اور حق بات کے بعض دوستوں تک نہ پہنچنے کی وجہ سے، وہ موجودہ ماحول کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور اپنی اندرونی خواہش کے برعکس دشمن کے برے پروپیگنڈے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس لمحے ان کا دل حق کی آواز سے آشنا ہوتا ہے، وہ اپنے ماضی پر نادم ہوتے ہیں اور سچائی کے سامنے اپنا دل و جان نچھاور کر دیتے ہیں۔

حضرت امام سجادؑ کے زمانے میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ کچھ حق تلاش کرنے والے بنو امیہ کے ناسالم ماحول کے اثر میں آ گئے تھے۔ امام زین العابدینؑ، جو جانتے تھے کہ یہ لوگ دشمن کے دھوکے میں آ گئے ہیں لہٰذا آپ ایسے لوگوں سے نرم اور ہمدردانہ لہجے میں بات کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ انہیں سیدھے راستے پر لے آئیں۔

اس سلسلے کی ایک واضح مثال امام سجادؑ کا اس شامی بوڑھے کے ساتھ مہربانانہ سلوک ہے جو قیدیوں کے شام کے شہر میں داخل ہوتے وقت امام کے پاس پہنچا اور کہنے لگا:

"خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں ہلاک کیا اور لوگوں کو تمہارے شر سے پاک کیا اور امیر المومنین یزید کو تم پر غالب کیا۔"

امام نے ایک نظر میں سمجھ لیا کہ یہ شخص دشمن کے دھوکے میں ہے، تو آپ نے انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ اس سے بات کی۔ آخر میں شامی بوڑھے نے اپنی باتوں پر ندامت کا اظہار کیا۔ آخرکار یزید نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ (لہوف، سید ابن طاووس، ص۱۷۶-۱۷۷)۔

مقامات حضرت فاطمہ زہراؑ آیات کی روشنی میں

- تحریر: مولانا سید کاشف محمد رضوی زید پوری صاحب۔
  - طالب علم جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم ایران

خلاصہ مطالب

آیات اور روایات، جو شیعہ و سنی دونوں کے یہاں معتبر ہیں، قرآن کی کئی آیات میں حضرت فاطمہؑ کا ذکر آیا ہے، لیکن ان کا نام براہِ راست ذکر نہیں کیا گیا ہے، جیسے امامانِ شیعہ کے بارے میں آیا ہے۔ اہل سنت اور اہل تشیع کے محققین اور مصنفین نے مختلف آیات کو حضرت فاطمہؑ کے بارے میں سمجھا ہے۔ بعض نے ۳۰ آیات، بعض نے ۶۰ آیات جو کہ ۴۱ سورہ میں آئی ہیں، اور بعض نے ۱۳۵ آیات جو کہ ۶۷ سورہ میں آئی ہیں، حضرت فاطمہؑ کے بارے میں قرار دی ہیں۔ یہ اختلاف آیات کی نوعیت اور ان کی تخصیص کی وجہ سے ہے: کبھی ایک ہی آیت میں حضرت فاطمہؑ کے بارے میں دو مختلف موضوعات ذکر کیے گئے ہیں اور کبھی ایک آیت میں فقط حضرت فاطمہؑ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زیادہ تر اس انتساب کا تعلق احادیث سے ہے، مگر بعض دفعہ شانِ نزول، مصداقِ آیت کے مطابق اور بعض اوقات آیات کے تفسیر یا تأویل اور بطن سے یہ انتساب کیا گیا ہے۔ (مک اولیف، اسکندر لو و رضائی اصفہانی، «فاطمہ در قرآن»، قرآن پژوہی خاور شناسان)۔

اس میں بنیادی طور پر مختلف تفسیری وجوہات اور اختلافات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کیسے مختلف علماء نے حضرت فاطمہؑ کے ذکر کو مختلف آیات میں دیکھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علمائے شیعہ و اہل سنت اس بات کے قائل ہیں کہ یہ آیات و روایات حضرت فاطمہ زہراؑ کے لیے بلند و بالا مقامات کو بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض اہم مقامات میں مقام اصطفاء، رضایت و غضب کا محور ہونا، بضعہ ہونے کا درجہ، صدیقہ ہونے کا مقام اور قرآن میں ان کی اہمیت جیسے سورہ دخان، سورہ قدر اور سورہ کوثر آیہ نور و سورہ انسان و آیہ مباہلہ و آیہ مودت کا ذکر کیا گیا ہے، جو ان کی فضیلت کو دیگر تمام مخلوقات پر ظاہر کرتی ہیں۔

کلیدی الفاظ: حضرت فاطمہ زہراؑ ، اصطفاء، رضایت و غضب، صدیقہ، روایات، قرآن۔

مقدمہ

حضرت فاطمہ زہراؑ کا مقام اور عظمت اتنی بلند ہے کہ کوئی بھی شخص، سوائے اہل بیتؑ کے، اس کے بارے میں بات نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں، بات کرنا اور کسی بات کو سننا ایک چیز ہے، اور اس بات کو سمجھنا اور اس کا ادراک کرنا بالکل مختلف معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت صدیقہ کبریٰ سلام اللہ علیہا ایک ایسی شخصیت ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رازوں میں سے ایک راز بنایا ہے، اور ان کے بارے میں یہ راز صرف اہل بیتؑ ہی جان سکتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً، حضرت فاطمہ زہراؑ کون ہیں کہ جن کی پہچان اور معرفت سے انسان عاجز ہے؟ کون سی ایسی گوہر نایاب ہیں کہ جن کی خدمت میں ملائکہ کو فخر حاصل ہے؟

یہ مقالہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ حضرت صدیقہ طاہرہ سلام اللہ علیہا کے مقامات میں سے کچھ کو بیان کرے تاکہ ہم اس گوہر نایاب کی کچھ معرفت حاصل کر سکیں، جن کی نہ صرف قرآن میں تعریف کی گئی ہیں، بلکہ فریقین کی روایات میں بھی ان کی فضیلت تسلیم کی گئی ہے۔ جس کے ذریعے اہل علم کو معرفت حاصل ہو اور دشمنوں کے لیے حجت قائم ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت صدیقہ کبریٰ سلام اللہ علیہا، رسالت اور امامت کے درمیان ایک اہم رابطے کی علامت ہیں۔

قرآن کریم میں حضرت فاطمہ زہراؑ کا مقام

قرآن کریم میں تین سورے ایسی ہیں جن میں حضرت صدیقہ طاہرہ سلام اللہ علیہا کا ایک اہم مقام ذکر کیا گیا ہے۔

سورہ دخان

حم وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ۔ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ...

(حا، میم. سوگند ہے کتاب روشنگر کی، (جسے) ہم نے ایک بابرکت رات میں نازل کیا ہے...(دخان ۳-۱) روایات کے مطابق، اس بابرکت رات سے مراد حضرت فاطمہ زہراؑ ہیں۔

اس آیہ شریفہ کے تحت ایک طویل روایت آئی ہے، جس کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے، جو اس بحث سے متعلق ہے؛ امام کاظم علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک نصرانی شخص نے اس آیہ کے بارے میں سوال کیا:

فَقَالَ النَّصْرَانِي إِنِّي أَسْأَلُكَ أَصْلَحَكَ اللَّهُ قَالَ سَلْ قَالَ أَخْبِرْنِي عَنْ كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ نَطَقَ بِهِ ثُمَّ وَصَفَهُ بِمَا وَصَفَهُ بِهِ فَقَالَ حم. وَ الْكِتابِ الْمُبِينِ. إِنَّا أَنْزَلْناهُ فِي لَيْلَةٍ مُبارَكَةٍ إِنَّا كنَّا مُنْذِرِينَ. فِيها يفْرَقُ كلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ مَا تَفْسِيرُهَا فِي الْبَاطِنِ فَقَالَ أَمَّا حم فَهُوَ مُحَمَّدٌ صلى الله عليه و

آله وسلم وَ هُوَ فِی کتَابِ هُودٍ الَّذِی أُنْزِلَ عَلَیهِ وَ هُوَ مَنْقُوص الْحُرُوفِ وَ أَمَّا الْکتابِ الْمُبِینِ فَهُوَ أَمِیرُ الْمُؤْمِنِینَ عَلِی علیه السلام وَ أَمَّا اللَّیلَةُ فَفَاطِمَةُ علیها السلام وَ أَمَّا قَوْلُهُ فِیها یفْرَقُ کلُّ أَمْرٍ حَکیمٍ یقُولُ یخْرُجُ مِنْهَا خَیرٌ کثِیرٌ فَرَجُلٌ حَکیمٌ وَ رَجُلٌ حَکیمٌ وَرَجُلٌ حَکیمٌ.

ایک نصرانی (عیسائی عالم) نے امام (علیہ السلام) سے عرض کیا:

"اے فرزندِ رسول، میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، خدا آپ کی اصلاح فرمائے۔"

امام نے فرمایا: "پوچھو۔"

اس نے کہا: "مجھے اس کتابِ خدا کے بارے میں بتایئے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی اور جس کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا ہے:

حم. وَالْکِتَابِ الْمُبِینِ. إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَیْلَةٍ مُبَارَکَةٍ إِنَّا کُنَّا مُنذِرِینَ. فِیهَا یفْرَقُ کُلُّ أَمْرٍ حَکِیمٍ

"حم، قسم ہے اس روشن کتاب کی، بے شک ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں نازل کیا، یقیناً ہم ڈرانے والے ہیں، اس رات میں ہر حکیمانہ امر جدا اور ظاہر کیا جاتا ہے۔" (سورہ دخان، ۱-۴)

بتایئے اس آیت کی باطنی (باطنی و معنوی) تفسیر کیا ہے؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"جہاں تک حم کا تعلق ہے، وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

اور الکتاب المبین (روشن کتاب) سے مراد امیر المؤمنین علی علیہ السلام ہیں۔

اور لیلۃ (رات) سے مراد فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں۔

اور خدا کا فرمان فِیهَا یفْرَقُ کُلُّ أَمْرٍ حَکِیمٍ یعنی 'اس میں ہر حکیمانہ امر ظاہر کیا جاتا ہے' — اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے (یعنی فاطمہ سے) خیرِ کثیر ظاہر ہوگا؛ ایک حکیم مرد، ایک اور حکیم مرد، اور ایک تیسرا حکیم مرد (یعنی حسن، حسین، اور مہدی علیہم السلام)۔"

یہ روایت ایک باطنی یا تأویلی تفسیر ہے، جس میں قرآن کے الفاظ کی ظاہری کے بجائے روحانی و رمزی معانی بیان کیے گئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حم سے مراد حضرت "محمد" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جو وحی کے حامل اور دین کے مظہر ہیں۔

الکتاب المبین سے مراد حضرت "علی" علیہ السلام ہیں جو قرآن کے مفسر، شارح، اور حقیقتِ قرآن کے مظہر ہیں۔

اللیلۃ المبارکۃ سے مراد حضرت "فاطمہ" سلام اللہ علیہا ہیں جو نورانی شب کی مانند ہیں، جن سے خیر اور ہدایت کا ظہور ہوا۔

اِمر حکیم سے مراد حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بطنِ مبارک سے ظاہر ہونے والی معصوم حکیم نسل ہیں جن میں حضرات ـــــامام حسن، حسین، اور قائم (عجل اللہ فرجہ) ـــــ ہیں جو سب کے سب "رجال حکیم" (دانشمند و معصوم امام) ہیں۔ (کافی، ج۱ ص۴۷۸)

گویا اس آیت کی باطنی تفسیر میں اہل بیتؑ کو قرآنِ مجسم اور مظاہرِ وحی کے طور پر پیش کیا گیا ہے

سورۃ قدر

"إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" ؛ "بیشک ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا۔" (سورہ قدر ا)

امام صادقؑ نے اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں فرمایا:

"اَللَّيْلَةُ فَاطِمَةُ، وَ اَلْقَدْرُ اَللّٰهُ، فَمَنْ عَرَفَ فَاطِمَةَ حَقَّ مَعْرِفَتِهَا فَقَدْ أَدْرَكَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ، وَ إِنَّمَا سُمِّيَتْ فَاطِمَةَ لِأَنَّ الْخَلْقَ فُطِمُوا عَنْ مَعْرِفَتِهَا"۔ یعنی "لیلہ" (رات) سے مراد فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں، اور "قدر" سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ پس جس نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اُن کی حقیقت کے مطابق پہچان لیا، اُس نے دراصل شبِ قدر کو درک کر لیا۔ اور انہیں "فاطمہ" اس لیے کہا گیا کہ مخلوقات اُن کی حقیقی معرفت حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔" (تفسیر الفرات ص۵۸۱)۔

لہٰذا اس آیۂ مبارکہ میں "لیلہ" (رات) سے حضرت صدیقہ کبریٰ سلام اللہ علیہا مراد ہیں۔

شبِ قدر، جو قرآن کے نزول اور تقدیر کے فیصلوں کی رات ہے، حضرت فاطمہ زہراؑ کے نام سے موسوم کی گئی ہے۔

وہی شبِ قدر جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ وہ ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

حقیقتاً فاطمہ زہراؑ کی ذات کیا عظیم ہستی ہے کہ خداوند متعال نے شبِ قدر کو سمجھنے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کی شرط، حضرت زہرا کی معرفت کو قرار دیا ہے۔

جو شخص حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے مقام اور حقیقت کو پہچان لے، وہ دراصل شبِ قدر کو سمجھ چکا ہے۔

شاید یہ بھی اُن عظیم الٰہی اسرار میں سے ایک راز ہو جسے صرف اللہ تعالیٰ اور اہل بیتؑ ہی جانتے ہیں، اور ہماری عقلیں اُس کے درک سے عاجز ہیں۔

سورۃ کوثر

"إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ"، "بیشک ہم نے آپ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کوثر عطا کیا۔" (سورہ کوثر ۱)

مرحوم طبرسی (رحمتہ اللہ علیہ) اس آیۂ مبارکہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

" (کوثر) سے مراد کثرتِ نسل و ذریت ہے، اور یہ بات نسلِ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں، جو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی اولاد سے ہے، واضح طور پر ظاہر ہو چکی ہے۔ کیونکہ ان کی تعداد شمار سے باہر ہے، اور بحمد اللہ ان کی نسل تا قیامت باقی رہے گی۔

یہ تفسیر اُس شانِ نزول کے عین مطابق ہے جو اس سورہ کے بارے میں نقل کی گئی ہے، کہ عاص بن وائل سہمی نے جب رسول خداؐ کے فرزند عبداللہ کا انتقال ہوا تو (نعوذ باللہ) آپ کو 'ابتر' یعنی 'بے نسل' کہا۔ قریش نے بھی یہی طعنہ دیا اور کہا: محمد (ص) "صنبور" ہے (یعنی جس کی نسل آگے نہیں بڑھے گی)۔

پس یہ سورہ نازل ہوا تاکہ ان کے ان بیہودہ اقوال سے پیدا ہونے والے غم و اندوہ کو رسول خداؐ کے دل سے دور کیا جائے اور ان کی باطل باتوں کو باطل و نابود کر دیا جائے۔" (تفسیر جوامع الجامع ج ۳ ص ۸۵۶)

"کوثر" دراصل لا محدود خیر و برکت کے معنی میں ہے، اور خداوند متعال نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو ہی اس "خیرِ کثیر" کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمایا۔

تاکہ وہ بدزبان دشمن جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "ابتر" کہا کرتے تھے، ان کی زبانیں بند ہو جائیں۔

آیات سورہ نور

یہ آیات سورہ نور کی آیات ۳۵ سے ۳۸ کو آیات نور کہا جاتا ہے۔ روایتی بحث میں المیزان میں ایسی احادیث آئی ہیں جو ان آیات کا مصداق اہلبیت پیامبر کو قرار دیتی ہیں اور مشکواۃ کو حضرت فاطمہ زہراؑ سے تعبیر کرتی ہیں۔ اس کے بعد یہ وضاحت دی گئی ہے کہ ان آیات میں ذکر ہونے والے "بیوت" سے مراد انبیاء کے گھروں کا ذکر ہیں، اور ان میں حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کا گھر بھی شامل ہے۔ (طباطبایی، ترجمۂ تفسیر المیزان، ۱۵: ۱۹۵–۱۹۶)

اسی طرح روح المعانی میں بھی آیت ۳۶ کی تفسیر سے "بیوت" کے متعلق وہی روایت آئی ہے کہ یہاں مراد انبیاء کے گھر ہیں۔ (آلوسی، روح المعانی، ۱۸: ۱۷۴)

ابن مغازلی اپنی کتاب مناقب میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں حضرت موسی کاظمؑ سے

روایت ہے کہ آیت میں ذکر ہونے والی "مِشکاۃ" اور "کَوکَبٌ دُرّیٌّ" کا مصداق حضرت فاطمہؑ ہیں۔ (ابن مغازلی، مناقب مغازلی، ۲۶۳–۲۶۴)

یہاں قرآن کی ان آیات کے بارے میں مختلف تفسیری روایات کی وضاحت کی گئی ہے، جس میں حضرت فاطمہؑ کا ذکر اور ان کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

آیت تطہیر اور اصحاب کساء

علامہ طباطبائی نے اپنی تفسیر المیزان میں اس آیت کی جامع بحث کی ہے اور اس آیت کے مخاطب کو اصحاب کساء قرار دیا ہے۔ وہ اس بارے میں ایسی احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو سات سو سے زائد ہیں اور جن میں سے بیشتر احادیث اہل سنت سے آئی ہیں۔ اہل سنت میں اس حدیث کے راویوں میں ام سلمۃ، ابو سعید خدری، سعد بن ابی وقاص، واثلہ بن اسقع، ابو الحمراء، ابن عباس، ثوبان (جو پیغمبر اسلام کے آزاد کردہ غلام تھے)، عبد اللہ بن جعفر، علی بن ابی طالب، حسن بن علی اور کئی دیگر شامل ہیں، اور ان احادیث کے قریب چالیس مختلف طرق اہل سنت میں نقل ہوئے ہیں۔

شیعہ راویوں میں علی بن ابی طالب، علی بن حسین، محمد باقر، جعفر صادق، علی بن موسی الرضا، ام سلمہ، ابوذر، ابوالاسود دؤلی، عمرو بن میمون اودی اور سعد بن ابی وقاص جیسے افراد شامل ہیں اور ان کے ذریعے اس حدیث کے تیس سے زائد مختلف طرق نقل ہوئے ہیں۔ (طباطبایی، ترجمۂ تفسیر المیزان، ۱۶: ۴۶۲–۴۷۷)

الوسی نے اپنی تفسیر میں مختلف روایات کا ذکر کرتے ہوئے اہل بیت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ آیت اصحاب کساء پر نازل ہوئی ہے۔ تاہم، وہ عصمت اور طہارت کے موضوع پر شیعہ عقیدہ کو رد کرتے ہوئے اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اہل بیت معصوم ہیں، اور اس آیت کو ایک شرط کے طور پر دیکھتے ہیں، نہ کہ ایک خبری آیت جو ماضی میں کسی واقعہ کو بیان کرے۔ (آلوسی، روح المعانی، ۲۲: ۱۲–۲۰)۔

طبری جامع البیان میں مختلف احادیث نقل کرتے ہیں جن میں اس آیت کو علی، فاطمہ، حسن اور حسین کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین کا ماننا ہے کہ اس آیت سے مراد اہل بیتِ پیامبرؐ یہی افراد ہیں۔ (طبری، جامع البیان، ۲۲: ۵–۷)۔

بیضاوی نے اپنی تفسیر انوار التنزیل میں کہا ہے کہ شیعہ اس آیت کو علی، فاطمہ اور ان کے دو بیٹوں کے بارے میں مانتے ہیں اور عصمتِ اہل بیت کے حوالے سے اس آیت کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس احتجاج کا پہلے اور

بعد کے آیات سے کوئی تناسب نہیں ہے اور احادیث صرف اتنا کہتی ہیں کہ یہ لوگ اہل بیتِ پیامبرؐ میں شامل ہیں۔ (بیضاوی، انوار التّنزیل، ۴: ۲۳۱)۔

فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اس آیت کے اہل بیت کے بارے میں مختلف آراء کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے مطابق سب سے معتبر رائے یہ ہے کہ اہل بیت میں پیغمبرؐ کے اہل خانہ، یعنی علی، فاطمہ، حسن، حسین اور ان کی بیویاں شامل ہیں۔ (فخر رازی، التفسیر الکبیر، ۲۵: ۲۱۰)

ابن کثیر نے تفسیر القرآن العظیم میں حدیث نقل کی ہے کہ پیغمبرؐ چھ ماہ تک فاطمہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر اہل بیت کو نماز کے لیے آواز دیا کرتے تھے اور حدیث کساء بھی بیان کی ہے۔ (ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۶: ۳۶۵–۳۷۱)

ابن عطیہ نے المحرر الوجیز میں ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق یہ آیت پیغمبرؐ، علی، فاطمہ، حسن اور حسین کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ (ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۴: ۳۸۴)

تأویلاتُ اہل السنۃ میں بھی کہا گیا ہے کہ شیعہ اس آیت کو اہل بیت (علی، فاطمہ، حسن، حسین) کے بارے میں مانتے ہیں اور اس کی دلیل حدیث کساء سے لیتے ہیں۔ (ماتریدی، تأویلات اہل السنۃ، ۸: ۳۸۲–۳۸۳)

آیۂ مودت آیت ۲۳ سورہ شوریٰ

المیزان میں آیت ۲۳ سورہ شوریٰ کی تفسیر میں مختلف مفسرین کی آراء کو بیان کیا گیا ہے اور ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں "مَوَدَّتِ قُربیٰ" کا مفہوم، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت سے محبت قرار دیا گیا ہے — یعنی علی، فاطمہ، حسن اور حسین۔ اس کے بعد مختلف روایات کا ذکر کیا گیا ہے جو اہل سنت اور شیعہ دونوں کے حوالے سے اس مفہوم کی وضاحت کرتی ہیں۔ (طباطبایی، ترجمۂ تفسیر المیزان، ۱۸: ۵۹–۶۸، ۷۳–۷۷)

آلوسی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے ابن عباس کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں پیغمبر سے "قُربیٰ" کے بارے میں سوال کیا گیا، اور پیغمبرؐ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو اس کا جواب دیا۔ آلوسی مزید کہتے ہیں کہ اہل بیت کے بارے میں اس آیت کے نزول کے حوالے سے اتنی زیادہ احادیث موجود ہیں کہ ان کو شمار کرنا ممکن نہیں۔ آخر میں وہ حدیث سفینہ کا بھی ذکر کرتے ہیں، جس میں پیغمبرؐ نے اہل بیت کو کشتی نوح کے مانند قرار دیا ہے۔

دوسری طرف، روح المعانی میں شیعہ عقیدہ کے رد میں کہا گیا ہے کہ اس آیت میں "مودّت" سے مراد اہل بیت سے محبت ہے، لیکن یہ آیت اس بات پر

دلیل نہیں کہ اہل بیت کی امامت یا طاعت واجب ہے۔(آلوسی، روح المعانی، ۲۵: ۳۰—۳۳)

جامع البیان میں طبری نے **"قُربیٰ"** کے مختلف معانی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس آیت میں "قُربیٰ" سے مراد پیغمبرؐ کے قریبی رشتہ دار ہیں۔(طبری، جامع البیان، ۲۵: ۱۵—۱۷)۔

فخر رازی نے تفسیر کبیر میں تفسیر کشّاف کے حوالے سے کہا ہے کہ پیغمبرؐ سے پوچھا گیا تھا کہ "قُربیٰ" سے کیا مراد ہے، اور پیغمبرؐ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو اس کا مصداق قرار دیا۔ ابن عطیہ نے المحرر الوجیز میں بھی یہی بیان کیا کہ "قُربیٰ" سے مراد پیغمبرؐ کے اہل خانہ ہیں۔ (فخر رازی، التفسیر الکبیر، ۲۷: ۱۶۷۔ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۵: ۳۴)۔

ابن کثیر نے تفسیر القرآن العظیم میں علی بن حسین کی اسیری کے دوران دمشق میں ایک شخص کے ساتھ ہونے والے واقعے کا ذکر کیا ہے، جس میں اس شخص نے "قُربیٰ" کے بارے میں سوال کیا اور علی بن حسین نے اس آیت کی مدد سے اس کا جواب دیا۔ (ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۷: ۱۸۳—۱۸۴)

آیۂ مباہلہ

علامہ طباطبائی کے مطابق، رویداد مباہلہ صدر اسلام کا ایک اہم واقعہ ہے، جس میں پیغمبر اسلام اور ان کے اہل بیت ایک طرف تھے اور مسیحی نجران کے لوگ دوسری طرف۔ اس واقعے میں مسیحیان نجران نے پیغمبرؐ سے عقیدہ کی درستگی پر بات کی، اور اس گفتگو کا انجام اس حد تک پہنچا کہ پیغمبرؐ نے مباہلہ کی درخواست پیش کی۔(طباطبایی، ترجمۂ تفسیر المیزان، ۳: ۳۵۰—۳۸۵)۔

دونوں طرف کے لوگ اپنے ساتھ اپنے افراد کو لے کر مباہلے کے مقام پر پہنچے۔ جب مسیحیوں نے دیکھا کہ پیغمبرؐ اپنے سب سے قریبی افراد — علی، فاطمہ، حسن اور حسین — کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لیے آئے ہیں، تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ اس مباہلے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے، کیونکہ پیغمبرؐ کا اپنی اہل بیت کے بارے میں یہ رویہ، ان کے عقیدہ کے بارے میں پختہ یقین کو ظاہر کرتا تھا۔(طباطبایی، ترجمۂ تفسیر المیزان، ۳: ۳۵۰—۳۸۵)

روح المعانی میں بھی، مسیحیوں کی پیغمبرؐ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مباحثہ اور پھر پیغمبرؐ کی طرف سے مباہلہ کی پیشکش کے بعد، موجودہ روایات کو نقل کیا گیا ہے۔ اس میں ذکر کیا گیا کہ "آیت مباہلہ" میں ذکر ہونے والے افراد — یعنی علی، فاطمہ، حسن اور حسین — ہی وہ لوگ ہیں جو اس واقعے میں شامل تھے، اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیت کی برتری ہے۔(آلوسی، روح المعانی، ۳: ۱۸۸—۱۹۰)۔

اسی طرح، فخر رازی، بیضاوی (انوار التنزیل)، محلّی، سیوطی، ابن کثیر (تفسیر القرآن العظیم) اور ابن عطیہ اندلسی (المحرر الوجیز) نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ مباہلے میں شریک افراد علی، فاطمہ، حسن اور حسین تھے۔ (فخر رازی، التفسیر الکبیر، ۸: ۸۹–۹۰۔ بیضاوی، انوار التّنزیل، ۵: ۳۴۲۔ محلّی و سیوطی، تفسیر الجلالین، ۳: ۶۰۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲: ۴۶۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۱: ۴۴۷–۴۴۸)۔

سورۂ انسان

سید محمد حسین طباطبایی، جو کہ شیعہ مفسر ہیں، اس سورہ کی تفسیر میں روایات کا حوالہ دیتے ہوئے، جو اہل سنت اور شیعہ کی کتابوں میں موجود ہیں، بیان کرتے ہیں کہ اس سورت کا شأن نزول علی اور فاطمہ اور ان کے بچے کی بیماری یا بچوں کی بیماری کے ساتھ منسلک ہے، اور اس میں نذر کا ذکر ہے جو بچوں کی صحت یابی کے لیے کی گئی تھی۔

علامہ طباطبایی روایات ترتیب نزول سورتوں، سیاق آیات اور دیگر متعلقہ روایات کی روشنی میں اس سورت کو مدنی قرار دیتے ہیں۔

وہ اہل سنت کی بعض روایات کا ذکر کرتے ہیں جن میں ایک سیاہ فام شخص کی پیغمبر سے ملاقات اور اس سورہ کے نزول کے سبب کے حوالے سے بات کی گئی ہے، لیکن علامہ طباطبایی ان روایات کی تنقید کرتے ہوئے ان کی انتساب کو رد کرتے ہیں اور اس سورت کے نزول کو اہل بیت کے متعلق ثابت کرتے ہیں۔ (طباطبایی، ترجمۂ تفسیر المیزان، ۲۰: ۲۱۱–۲۲۰)۔

اہل سنت کے مفسر شہاب الدین آلوسی نے بھی مختلف روایات اور مفسروں کی آراء کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کو بیان کیا ہے اور اسے اہل بیت سے متعلق قرار دیا ہے۔

آلوسی نے ترمذی اور ابن جوزی کی روایات اور آیات کے ظاہری مفہوم کی روشنی میں کہا ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ علی اور فاطمہ کے بچے مدینہ میں پیدا ہوئے تھے، جو آیات کے ظاہری مفہوم سے متصادم نہیں۔

آلوسی نے اس سورہ کی لطافت بھی بیان کی کہ اس میں فاطمہ زہرا کی تعظیم کے پیش نظر کہیں "حورالعین" کا ذکر نہیں آیا بلکہ صرف "ولدان مخلدون" (ہمیشہ زندہ رہنے والے بچے) کا ذکر ہے۔ (آلوسی، روح المعانی، ۲۹: ۱۵۷–۱۵۸)

فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں، زمخشری کی تفسیر البسیط سے روایت نقل کی ہے کہ علی اور فاطمہ کے بچوں کی بیماری کی داستان بیان کی گئی ہے، لیکن انہوں نے کہا ہے کہ ان آیات کا اختصاص علی، فاطمہ اور ان کے بچوں تک لازم نہیں ہے، بلکہ یہ آیات

تمام نیک اور متقی صحابہ پر بھی صادق آتی ہیں، جب تک کہ خاص اطاعت یا فرمانبرداری کا ذکر نہ ہو۔ (فخر رازی، تفسیر کبیر، ۳۰: ۲۴۴-۲۴۵)

شوکان اپنی کتاب فتح القدیر میں ابن مردویہ سے ابن عباس کی روایت نقل کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ یہ آیات علی بن ابی طالب اور فاطمہ زہرا کے بارے میں ہیں۔ (شوکانی، فتح القدیر، ۵: ۴۲۱)

نتیجہ گیری

آیات اور ان کی تفسیری روایات کی روشنی میں جو دونوں فرقوں کے لیے قابل قبول ہیں، حضرت صدیقہ طاہرہ سلام اللہ علیہا کو بہت سے اعلیٰ مقامات اور منزلتیں حاصل ہیں جن میں مقام اصطفاء شامل ہے، جس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس علم، عصمت، حجیت اور امت پر برتری ہے۔

لہٰذا اہل سنت برادران کو چاہیے کہ وہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ان مقامات کو قبول کریں، اور ان کی اطاعت کریں کیونکہ ان کی رضا و غضب کا محور حضرت صدیقہ کبری سلام اللہ علیہا ہیں، جن کا تذکرہ عامہ میں بھی ہوا ہے اور یہ بات حجت ہے۔ شیعہ و سنی دونوں کے لیے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی معرفت و اطاعت ضروری ہے۔

منابع و مآخذ

- قرآن کریم
- محمد باقر مجلسی، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار، مؤسسۃ الوفاء، چاپ دوم بیروت ۱۴۰۴ق.
- عیون اخبار الرضا علیہ السلام، تصحیح سید مہدی حسینی لاجوردی، انتشارات جہان، تہران ۱۳۷۸ق.
- حاکم نیشابوری، محمد بن عبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، تحقیق یوسف عبدالرحمٰن مرعشلی، دار المعرفۃ، بیروت.
- ابن عساکر، علی بن حسن، تاریخ مدینہ دمشق، تحقیق علی شیری، دار الفکر، بیروت ۱۴۱۵ق.
- ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی، الإصابۃ فی تفسیر الصحابۃ، تحقیق شیخ عادل احمد عبدالموجود و شیخ علی محمد معوض، دار الکتب العلمیۃ، چاپ اول بیروت ۱۴۱۵ق.
- ہیثمی، نورالدین ابو بکر، مجمع الزوائد، دار الکتب، بیروت ۱۴۰۸ق.
- ابن قتیبہ، ابو محمد عبداللہ بن مسلم دینوری، الإمامۃ والسیاسۃ معروف بتاریخ الخلفاء، تحقیق علی شیری، دار الاضواء، بیروت، چاپ اول ۱۴۱۰ق.
- ہلالی کوفی، سلیم بن قیس، کتاب سلیم بن قیس، تحقیق محمد باقر انصاری زنجانی، الہادی، قم، چاپ اول ۱۴۱۵ق.
- صدوق، محمد بن علی، الامالی، ترجمہ آیت اللہ کمرہ ای، چاپ چہارم، کتابخانہ اسلامیہ، تہران، ۱۳۶۲ق.
- بخاری، محمد ابن اسماعیل، صحیح البخاری، دار الفکر، استانبول، ۱۴۰۱ق
- ترمذی، محمد بن عیسی، سنن الترمذی، تحقیق عبدالوہاب عبداللطیف، دار الفکر، بیروت، چاپ دوم ۱۴۰۳ق.
- نیشابوری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، دار الفکر، بیروت
- صدوق، محمد بن علی، علل الشرائع، مکتبۃ الداوری، قم.

- ابن شعبۃ حرانی، حسن بن علی، تحف العقول عن آل الرسول، تصحیح علی اکبر غفاری، چاپ دوم، مؤسسہ انتشارات اسلامی، قم، ۱۴۰۴ق.
- فراہیدی، خلیل بن احمد، العین، چاپ دوم، ہجرت، قم.
- ابو جعفر محمد بن حسن طوسی، الامالی، تحقیق: قسم الدراسات الاسلامیۃ، مؤسسۃ البعثۃ.
- ابو جعفر محمد بن حسن طوسی، تہذیب الاحکام، تحقیق و تعلیق سید حسن موسوی خراسان، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران بازار سلطانی، چاپ سوم.
- محمد محسن فیض کاشانی، الوافی، منشورات مکتبۃ امام امیر المؤمنین عامہ اصفہان، تحقیق ضیاء الدین حسینی اصفہانی، چاپ اول ۱۴۰۶ق.
- محمد بن یعقوب کلینی، الکافی، تحقیق علی اکبر غفاری، دار الکتب الاسلامیہ آخوندی، چاپ سوم ۱۳۸۸ق.
- فرات بن ابراہیم کوفی، تفسیر فرات کوفی، تحقیق محم کاظم، مؤسسۃ الطبع والنشر التابعۃ لوزارۃ الثقافۃ و ارشاد الاسلامی، طہران، چاپ یکم، ۱۴۱۰ق.
- شیخ آبی علی الفضل بن الحسن طبرسی، تفسیر جوامع الجامع، تحقیق مؤسسۃ نشر اسلامی، چاپ اول ۱۴۱۸ق۔

حضرت فاطمہ کلابیہ؛ ام البنین علیہاالسلام

■ تحریر: نہاں نقوی صاحبہ۔
○ طالبہ: جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم ایران

جناب فاطمہ زہرا (علیہاالسلام) کی شہادت کے بعد حضرت ام البنین (علیہاالسلام) وہ خاتون تھیں جو امیر المومنین علیؑ سے ازدواج کر کے گھر میں آئیں۔

آپ کی وفات بھی بی بی زہراؑ کی شہادت کے ایام کے ساتھ ہے۔ آپ ۱۳ جمادی الثانی سن ۶۴ یا ۷۰ ہجری میں وفات پائیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ یہاں آپ کے سلسلے میں چند اہم باتوں کا ذکر کیا جائے:

۱۔ حضرت ام البنینؑ کا خاندانی اعتبار سے بنی کلاب قبیلے سے تعلق تھا۔ آپ کا اصلی نام "فاطمہ کلابیہ" تھا لیکن حضرت فاطمہ زہراؑ کے احترام میں آپ نے شادی کے بعد اپنا نام بدل کر "ام البنین" رکھ دیا تھا اور مدینہ میں آپ اسی نام سے مشہور ہوئیں۔

۲۔ حضرت ام البنینؑ، شادی کے بعد سے ہمیشہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے فرزندوں لئے ایک مہربان ماں اور خادمہ کی طرح رہتی تھیں۔ جس دن آپ شادی کر کے امام علیؑ کے گھر تشریف لائیں تو حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ بیمار تھے۔ آپ آکر فورا دونوں شہزادوں کی خدمت میں مشغول ہو گئیں اور ایک مہربان ماں اور پرستار کی طرح دونوں شہزادوں کی شفایابی کے لئے خدمت کرتی رہیں یہاں تک کہ شہزادے شفایاب ہو گئے۔

۳۔ حضرت ام البنینؑ کو امیر المومنینؑ سے چار بہادر اور عظیم بیٹوں یعنی حضرت عباس علمدار کربلا، عبداللہ، جعفر، عثمان کی ماں بننے کا شرف حاصل ہوا۔

۴۔ بی بی ام البنینؑ نے اپنے چاروں بیٹوں کی تربیت صرف اور صرف مولا حسینؑ کی خدمت میں فنا اور قربان ہونے کے لئے کی تھی، اسی وجہ سے معرکہ کربلا کے وقت آپ نے فوراً اپنے تمام بیٹوں کو کربلا بھیج دیا اور آپ کے تمام بیٹے مولا حسینؑ پر قربان بھی ہوئے۔

۵۔ آپ اپنے بیٹوں کے بجائے شہزادی کائنات حضرت فاطمہ زہراؑ کے بیٹوں سے نہایت محبت کرتی تھیں چنانچہ جب اسیران کربلا کے مدینہ واپسی کی خبر آئی تو خبر سنانے والے بشیر سے ام البنینؑ پوچھتی ہیں کہ: "یابشیر اخبرنی عن ابی عبداللہ الحسینؑ اولادی و من تحت الخضراء کلھم فداءٌ لابی عبداللہ الحسینؑ"

"اے بشیر! مجھے میرے بچوں کے بارے میں نہیں بلکہ اباعبداللہ الحسینؑ کے بارے میں بتاؤ، میری تمام اولاد اور روئے زمین پر موجود تمام لوگ ابوعبداللہ پر قربان ہو جائے"۔

۶۔ حضرت ام البنینؑ نے اپنی زندگی کو جناب فاطمہ زہراؑ کے مقصد اور مشن اور اہداف کو آگے بڑھانے اور آپ کے اولاد کی خدمت کے لئے وقف کرر کھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کربلا کے بعد آپ ہمیشہ شہیدوں کی یاد اور ان کے مقصد کو زندہ رکھنے کے لئے مرثیہ، مجالس کا اہتمام کرتی تھیں اور اپنے بیٹوں کی قربانیوں کو بھلا کر جنت البقیع جاتی تھیں اور امام حسینؑ کی یاد میں نشان قبر بناتی تھیں اور مرثیے پڑھتی تھیں۔

۷۔ حضرت ام البنینؑ ایک شیر دل، بہادر خاتون تھیں، آپ ایثار و قربانی کا عظیم مجسمہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی قربانیوں اور عظمتوں کو اہل بیت اطہارؑ نے ہمیشہ یاد فرمایا ہے۔

۸۔ جناب فاطمہ زہراؑ اور آپ کی اولاد کا جو احترام جناب حضرت ام البنینؑ نے عملی طور پر کر کے ہمیں دکھایا ہے وہ ہم سب کے لئے نمونہ عمل ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اہل بیتؑ اور خاندان عصمت و طہارت کے بزرگان نے بھی جناب حضرت ام البنینؑ کا احترام کیا اور آپ کی عظمتوں کو ہمارے میں بیان فرمایا ہے؛ یہاں چند اہم نمونوں کا ذکر کیا جارہا ہے:

الف: امام علیؑ کے بھائی جناب عقیل ابن ابیطالبؑ بیان کرتے ہیں کہ: "عربوں میں ام البنین کے باپ داداؤں سے زیادہ کوئی بہادر نہیں تھا"۔ شاید اسی وجہ سے جناب امام علیؑ نے جناب عقیل سے شادی کے لئے لڑکی تلاش کرنے کے لئے کہا تو فرمایا تھا کہ: "میں ایسے خاندان کی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے میرے لئے بہادر اور شجاع بیٹا پیدا ہو"۔ اور نتیجہ بھی یہی ہوا کہ حضرت عباس علمدار اور آپ کے بھائیوں جیسے شیر دل اور بہادر بیٹے پیدا ہوئے جن کی مثال معصومینؑ کے بعد کہیں نہیں ملتی ہے۔

ب: جناب شہید اول بیان کرتے ہیں کہ "ام البنینؑ ایک بامعرفت اور بافضیلت خاتون تھیں۔ آپ خاندان اہل بیتؑ کی بہ نسبت خالص محبت اور بے حد لگاؤ رکھتی تھیں۔ اور اپنے آپ کو پوری طرح ان کے لئے وقف کر دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ خاندان نبوت کے افراد کے نزدیک آپ کی منزلت بہت بلند تھی اور وہ آپ کا خاص احترام کیا کرتے تھے۔ خوشی اور عید کے دنوں میں آپ کی خدمت میں آتے تھے اور آپ سے احترام کا اظہار کرتے تھے۔"

۹۔ حضرت امام حسینؑ، جب کربلا کے لئے روانہ ہورہے تھے اور حضرت ام البنینؑ کے بیٹے آپ سے خداحافظی کے لئے حاضر ہوئے تو اس ماں نے بیٹے سے اظہار محبت والفت کے بعد یوں فرمایا:

اے میرے بیٹوں۔ اے میرے عزیزو۔ میرے مولا حسینؑ کی آنکھ اور دل بن کر رہنا۔ اور ہمیشہ آپ کے فرمانبردار رہنا۔

تم سب حسینؑ پر قربان ہو۔ کبھی بھی ان سے دور نہ ہونا۔ اپنے خون کے آخری قطرے تک ان کی حمایت کرنا۔

حضرت ام البنینؑ کے یہ جملے دراصل رہتی دنیا تک خاص طور پر جوانوں کے لئے عظیم پیغام ہے کہ "ہمیشہ اپنے وقت کے امام کے اشارے پر حرکت کرنا ہی اصل زندگی ہے"۔

۱۰۔ حضرت ام البنینؑ کی ذات ان عظیم شخصیتوں میں سے تھیں جنہوں نے حضرت فاطمہ زہراؑ کی اولادوں خاص طور پر حضرت امام حسینؑ کی عزاداری کو پھیلانے اور فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ حضرت ام البنینؑ کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ:

"عن جعفر ب بُكِيَ الحُسَينُ عليه السلام خَمسَ حِجَجٍ، و كانَت اُمُّ جَعفَرٍ الكِلابِيَةُ تَندُبُ الحُسَينَ عليه السلام وتَبكيهِ وقَد كُفَّ بَصَرُها، فَكانَ مَروانُ وهُوَ والِ المَدينَةِ يَجيءُ مُتَنَكِّرا بِاللَّيلِ حَتّى يَقِفُ، فَيَسمَعُ بُكاءَها و نَدبَها"۔

حضرت امام صادقؑ نے فرمایا: حضرت امام حسینؑ پر پانچ سالوں تک گریہ کیا گیا۔ ام جعفر کِلابی (یعنی حضرت ام البنینؑ)، امام حسینؑ پر مرثیہ پڑھتی تھیں اور اتنا گریہ کرتی تھیں کہ آپ کی آنکھیں نابینا ہوگئیں۔ مدینہ کا حاکم مروان ناشناس بن کر آتا تھا اور آپ کے دروازے پر کھڑا کر آپ کے مرثیہ کو سن کر رونے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ (کتاب امالی شجری، ج۱، ص۱۷۵)

ایک اشکال اور اس کا جواب

شہیدوں اور مرحومین کے لئے عزاداری کے مخالفین اور کچھ نادان افراد کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ مذکورہ روایت غلط ہے اس لئے کہ مروان جیسا دشمن کیسے ام البنینؑ کے گریہ کی آواز سن کر رو سکتا ہے؟ یا کیسے اہل بیتؑ کے خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون عزاداری اور غم منانے کے لئے اتنے بلند آواز سے مرثیہ پڑھ سکتی یا گریہ کرسکتی ہیں کہ نامحرم مرد سن کر رونے لگے؟

جوابات:

اس اشکال اور شبہہ کے مختلف جواب دیئے جاسکتے ہیں:

۱- اہل بیت اطہارؑ خاص طور پر امام حسینؑ کی مصیبت پر گریہ کرنا یا گریہ کرنے والے سے متاثر ہونا مروان جیسے دشمنوں کی طرف سے کوئی نئی بات نہیں ہے، تاریخ میں کئی دشمن اپنی سیاست اور حکومت کو بچانے کے لئے دکھاوے کے لئے روتے نظر آئے ہیں جیسے خود یزید اور ابن زیاد نے کربلا کے بعد جب لوگوں کا دباؤ بڑھنے لگا تو ظاہری طور پر گریہ کیا تھا۔ اسی طرح حضرت امام رضاؑ کو شہید کرکے خود مامون الرشید نے پورے ملک میں سوگ منوایا تھااور گریہ کیا تھا۔ اور آج بھی اس طرح کے بہت سی مثالیں ملتی رہتی ہیں کہ مظلوموں پر ظلم کرکے، انہیں شہید کرکے خود ظالم روتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۲- حضرت ام البنینؑ کا حضرت امام حسینؑ کے لئے گریہ کرنااور مرثیہ پڑھنا متعدد روایات میں بیان ہوا ہے لہٰذا صرف یہ ایک روایت نہیں ہے جس کے صحیح اور غلط ہونے کا شبہہ پیدا کرکے اصل حقیقت سے انکار کیا جاسکے۔

۳- اسلام کی نظر میں کوئی خاتون نامحرم کے سامنے غم اور مظلوم کی مظلومیت کو ظاہر کرنے کے لئے گریہ کرسکتی ہے، نوحہ پڑھ سکتی ہے۔اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ جیسا کہ خود پیغمبراکرمؐ کے زمانے میں بھی خود پیغمبراکرمؐ کے حکم سے شہید حمزہؓ اور پھر بعد میں جناب جعفر طیارؓ کی شہادت کے بعد ان شہیدوں کے گھر پر باقاعدہ عزاداری کا انعقاد ہوا، اس میں عورتیں جمع ہوئیں، نوحہ اور ماتم و گریہ ہوا، جس میں خود حضرت فاطمہ زہراؑ نے نوحہ و مرثیہ پڑھ کر گریہ کیا ہے۔اس کے علاوہ پیغمبراکرمؐ کی شہادت کے بعد بھی جناب فاطمہ زہراؑ کا گریہ کرنا، کربلا کے واقعات کے بعد معصوم کی موجودگی میں اہل حرم کی خواتین کا گریہ کرنا وغیرہ سب ہمارے لئے نمونہ عمل ہے۔ لہٰذا مرحوم کے لئے خاص طور پر مظلوم شہید کے لئے خواتین کا گریہ کرنا، نوحہ پڑھنااور عزاداری کرنا ممنوع نہیں ہے یا شرعی لحاظ سے اس میں کوئی مشکل اور حرج نہیں ہے۔

نوحہ غربت زہراؑ

▪ نتیجہ فکر: مولانا جعفر نقی صابری صاحب

غربت زہراؑ دیکھے زمانہ
لے کے عصا کو ہاتھوں میں چلنا

خم ہے کمر اٹھارہ برس میں
زخمی ہے ہائے بی بیؑ کا شانہ

چومتے تھے جس در کو پیمبرؐ
ہائے وہی دروازہ جلانا

حشر تلک بھولیں گی نہ بی بیؑ
بطن میں ہی محسن کا گزرنا

حق کے لئے دربار جفا میں
بعد نبیؐ شہزادیؑ کا جانا

پھاڑی گئی تحریر نبیؐ کی
حیف ہے زہراؑ کو جھٹلانا

سانس بھی لینا ہوگیا مشکل
کیل سے در کی زخمی ہے سینہ

کوکھ جلی پہلو ہے شکستہ
ہوگیا مشکل بی بیؑ کا جینا

رو نہ سکیں جی بھر جو پدر کو
ایک ہیں زہراؑ، ایک سکینہؑ

سوچ کے دل پھٹ جاتا ہے جعفرؔ
در کے تلے بی بیؑ کا تڑپنا

مدح شہزادی عالمؑ و ثانی زہراؑ

▪ نتیجہ فکر: مولانا سید معظم حسین زیدی صاحب

(۱)

میرے حصے میں دوعالَم کی سعادت آگئی
جشن کوثر میں مجھے، جب لے کے قسمت آگئی

فاطمہ زہراؑ کی جب دل میں ولایت آگئی
حاکمان ظلم سے لڑنے کی طاقت آگئی

اللہ اللہ کتنی عظمت، کتنی وسعت آگئی
ایک چادر میں رسالت، اور امامت آگئی

میں کبھی اس کو رضی اللہ کہہ سکتا نہیں
جس کی خاطر فاطمہؑ کے لب پہ لعنت آگئی

رحمت معبود کے جلوے دکھانے کے لئے
رحمۃ للعالمینؐ کے گھر میں رحمت آگئی

حضرت شبیرؑ کی مجلس، بپا ہونے لگی
گھر میں مجھ ناچیز کے، خاتون جنت آگئی

حیدر کرار کے جلوے دکھے عباسؑ میں
فاطمہ زہراؑ کی، زینبؑ میں نیابت آگئی

نام حیدرؑ سن کے، یہ مرحب نے، خیبر میں کہا
کرچکا میں خوب اودھم، آج شامت آگئی

چھ مہینے تک جہاں جاکر سلامی دے نبیؐ
آگ لے کر ہاں اسی چوکھٹ پہ امت آگئی

پلّہ میزان میں جب، نیکیاں کم رہ گئیں
کام میرے مدحت خاتون جنت آگئی

(۲)

علیؑ رفتار زینبؑ ہے، علیؑ گفتار زینبؑ ہے
سر بازار، حق کی بولتی تلوار، زینبؑ ہے

وفا و صبر و ہمت کی علمبردار زینبؑ ہے
ثبات و عزم کی اک لشکر جرّار زینبؑ ہے

ہماری جان و مال و عزت و اولاد ہر شیئ پر
ازل کے روز سے کل مالک و مختار زینبؑ ہے

ملوکیت توکب کی دفن ہے کالے اندھیروں میں
دیار شام میں لیکن ابھی ضوبار زینبؑ ہے

یمن، لبنان و ایران و عراق و شام میں اب بھی
یہ لگتا ہے کہ جیسے برسر پیکار زینبؑ ہے

ہمارا قافلہ پہونچے گا آخرکار مقصد تک
ہمیں کیا خوف ہے جب قافلہ سالار زینبؑ ہے

ٹھہر جائے گی اس کے "اُسکُنُوا" سے وقت کی رفتار
نہ ہرگز سوچنا کہ بے بس و لاچار زینبؑ ہے

صراط و قبر و محشر کی سنی تھیں سختیاں میں نے
نہ ہوگی پر کوئی منزل مجھے دشوار، زینبؑ ہے

ملے گر، داد یا پھر نا ملے، کیا فرق پڑتا ہے
در زینبؑ ہے، میں ہوں اور میرے اشعار، زینبؑ ہے

بسم الله الرحمن الرحيم

Under the Patronage of Hazrat Wali al-Asr (aj)

Akhtar Taban

اَختَرِ تابان

AKHTAR TABAN BIMONTHLY RESEARCH JOURNAL
YEAR 2 | NO. 3 | NOVEMBER & DECEMBER 2025

MAGAZINE PROFILE

Editor-in-Chief:
Hujjatul Islam
Syed Kazim Rizvi

Executive Director:
Maulana
Talim Raza Jafri

Deputy Executive Director:
Dr. Syed Baqir Eliya Rizvi

Graphics and Design:
Syed Rohullah Naqavi

Bonyad Akhtar Taban

Block 63, Alley 28, Safaiyah Street, Qom, Iran

+982537837506 | +989963778614

www.allamahrizvi.com

info@allamahrizvi.com

In the Name of Allah, the Most Gracious, the Most Merciful

The Prophet's (PBUH) Campaign Against the Jews of Medina- (2)

Analysis by: Rais al-Muballigheen Allamah Sayyid Saeed Akhtar Rizvi
Preparation by: Hujjatul Islam Moulana Sayed kazim Rizvi

Introduction

The topic of "The Prophet's (PBUH) response to the conspiracies of the Jews in Medina" refers to a complex series of historical events that occurred after the Hijrah. A more accurate and contextual translation from Islamic historical sources would be:

The reason for this is that these events were not a single "campaign," but rather the result of repeated treaty violations and acts of betrayal and hostility by certain tribes against the Muslim community, which ultimately necessitated a decisive response to ensure the survival of the community.

The first instance was the expulsion of Banu Qaynuqa, as they were the first tribe to violate their treaty with the Muslims and show hostility after the Muslim victory at Badr. They were besieged and eventually exiled from Medina.

The second instance was the expulsion of Banu Nadir: This tribe was found to be involved in a plot to assassinate the Prophet Muhammad (PBUH). After a siege, they were also exiled from Medina.

One of the most significant confrontations was the Battle of the Trench (Al-Ahzab) and the incident of Banu Qurayzah: During the Battle of the

Trench, the tribe of Banu Qurayzah violated their neutrality pact with the Muslims and conspired with the besieging Quraysh army. After the siege was lifted, their betrayal was addressed. Based on the ruling of an arbitrator from their own allied tribe, they were held accountable for their treachery.

In light of the aforementioned events and occurrences, it is imperative to gain a deeper understanding of these truths through research and historical analysis. The present text elucidates the key points from the historical books of Allamah Rizvi:

The Battle of Khaibar

The banishment of the Jewish tribes of Banu Nadhir and Banu Qinaqa' from Medina had accentuated the animosity of the Jews towards the Muslims. These tribes had settled down at Khaibar at a distance of about eighty miles from Medina. "Khaibar" means: "fortified place". It was a Jewish stronghold comprised of seven fortresses: Naaim, Qamus (on a hill of the same name), Katiba, Shiqu, Natat, Watih and Sulalim, of which Qamus was the most fortified.

These tribes were instigating other tribes to join them in a conclusive assault upon the Muslims. The Battle of Ahzab was the first attempt in which the Jews had participated for the siege of the Muslims. The reverses they had suffered had not deterred them. Their chief, Usir ibn Razam, collected all the Jewish tribes and solicited the aid of Ghatfan for a final showdown. To demonstrate their strength, Ghatfan sent a posse, which captured twenty camels of the Prophet after killing their herdsman and capturing his wife.

The news of the preparation of the Jews was reaching Medina frequently. At last, the Holy Prophet decided to crush them before they could destroy the Muslims. It was the "near victory" foretold in the Sura of "Victory" revealed just after the truce of Hudaibiyah:

Indeed God was well pleased with the Believers when they swore allegiance to thee under the tree, and He knew what was in their hearts, so He sent down tranquility

on them and rewarded them with a near victory. (Qur'an, 48:18)

By the middle of Muharram, 7 A.H., the Holy Prophet marched on Khaibar with 1,400 persons. In about seven days, six of the Jewish fortresses were overrun by the Muslims. Then Qamus was besieged. Abul Fida says the following in his book of history: (Tarikhu 'l-mukhtasar fi Akhbari 'l-basha):

In those days, the Prophet sometimes used to suffer from migraine. As a matter of chance, on the day he reached Khaibar, he suffered from the same. Abu Bakr, therefore, took the banner and went out to fight but returned unsuccessful. Then Umar took the standard and fought hard, more than his predecessor, but returned equally unsuccessful. When the Prophet came to know of these reversals, he said, "By Allah, tomorrow I will give the standard to a man who loves Allah and His Messenger and whom Allah and His Messenger love, one who is constant in onslaught and does not flee, one who will stand firm and will not return till victory is achieved".

Having heard this, both the Immigrants and the Helpers aspired for the flag. When the day dawned, having said the morning prayer, the Prophet came and stood among his companions. Then he called for the banner. At that moment, every companion was engrossed in the hope and desire of getting the flag, while the Prophet called for 'Ali who was suffering from red eyes. The Prophet took some of his own saliva on his finger and applied it to 'Ali's eyes. The eyes were at once cured and the Prophet handed over the standard to him.

Shaikh 'Abdul-Haqq Muhaddith Dehlavi (traditionist) writes in his Madarijun-Nubuwwah as follows:

" Then 'Ali started with the flag in his hand and, reaching under the fort of Qamus, planted the standard on a rock. A Rabbi who was watching from the fort asked, 'O standard-bearer! Who are you?' 'Ali replied, 'I am 'Ali son of Abu Talib.' The Rabbi called unto his people, 'By the Torah, you will be defeated!

This man will not go back without winning the battle'".

The author of Madarijun-Nubuwwah, states the following:

" Perhaps that Jew was well informed of 'Ali's valor and had seen his praises in the Torah".

He further states in his afore-mentioned book:

" Harith, brother of Marhab, first sallied forth from the fort with a huge spear whose point weighed about 3 mounds (a measure of weight, varying from a few lb. to 84 lb. according to the custom of the area). In his immediate attack, he killed a number of Muslim veterans. Then 'Ali proceeded towards him and dispatched him to hell. in one stroke. When Marhab was informed of his brother's plight, he rushed out of the fort accompanied by some of the bravest soldiers from the Khaibar garrison to avenge his brother's death. It is said that Marhab was the strongest, tallest, and the most fierce among the warriors of Khaibar and that none equalled him in his might.

That day, he was armed twice over, wearing double armor with two swords dangling by his sides. He was also wearing two turbans with a helmet over and above. He marched ahead in the battlefield singing about his own valor. Nobody among the Muslims dared to fight him in the battlefield. 'Ali, therefore, darted out, reciting about his own valiance in response to Marhab's. Taking the initiative, Marhab attacked 'Ali with his sword.

But 'Ali avoided the blow and rendered with Dhul-Fiqar such a forceful blow on Marhab's head that it cut through the latter's helmet, the double turban, the head, till it reached the man's throat. According to some narratives, it is said that he was cut up to his thigh, in others that it tore him into two parts upon the saddle. Marhab took his way to hell in two pieces. Then the Muslims under the command of 'Ali began fighting the Jews.

'Ali himself killed seven generals of the Jewish forces everyone of whom was considered to be most valiant. After these had been killed, the remnants of the Jewish troops ran helter-skelter

towards their fort. 'Ali followed them in hot pursuit. In this rush, one Jew delivered a blow to 'Ali's hand wherein he carried his shield. The shield fell down. Another Jew picked it up and made good with his booty. This infuriated 'Ali, who was now strengthened with such a spiritual force and divine strength that he jumped across the moat and came straight to the door of the iron gate. He dislodged it from its hinges, held it up as a shield, and resumed fighting".

According to Ibn Hisham's Sirat, and according to Al-Tarikh al-Kamil and Abul Fida's Tarikh, Abu Rafi' is cited saying:

" When the Prophet gave the flag to 'Ali and bade him fight the forces of Khaibar, we, too, accompanied him. When 'Ali was a short distance from the fort, fighting all along, a Jew struck a blow on his hand with such a force that the shield 'Ali was holding fell down. 'Ali at once pulled out a part of the gate of Khaibar, held it up as a shield and fought till Allah granted him a clear victory. Once the fighting was over, he threw it away. It was so heavy that eight men from among us could hardly turn it over from one side to the other".

An agreement was reached with the Jews of Khaibar. Their lands and movable property were left in their hands. They were allowed to practice their religion freely. In return for the protection they would receive, they were required to pay the Muslims half the produce of their lands. The Prophet maintained the right to turn them out of their lands whenever he so decided. The battle of Khaibar is important as it put an end to the Jewish resistance and, for the first time, a non-Muslim people were made "Protected Persons" of the Muslim commonwealth.

On the same day, Ja.'far ibn Abi Talib returned from Ethiopia. The Holy Prophet said:

" I do not know on which blessing of Allah I should thank Him more: on the victory of Khaibar or on the return of Jaf'ar"!

Fadak

The Holy Prophet then sent an expedition with 'Ali ibn Abi Talib to a Jewish tribe living in Fadak.

Without any battle, they agreed to the same terms as the people of Khaibar had.

The income from Khaibar was for all Muslims in general, whereas the income from Fadak was exclusively for the Prophet because it was taken without any use of force. Jalaluddin al-Suyuti states in Ad-Durr al-Manthur on the authority of Bazaar, Abu Yaala and Ibn Abi Hatim who have taken the tradition from Abu Sa'eed al-Khudri that when the verse: Wa aati dhal-Qurba Haqqahu (Qur'an, Chap. 17, V. 26), ("and give thy kinsfolk their dues") was revealed, the Prophet gave the property of Fadak as a gift to Fatimah. Ibn 'Abbas has narrated that:

" When the verse And give thy kinsfolk their dues' was revealed, the Prophet assigned the Fadak property to Fatimah".

A Visit to Mecca

According to the terms of the treaty with the Meccans, the Muslims could visit Mecca the next year. Towards the end of the seventh year of Hijra (March 629 C.E.) the Prophet, accompanied by about two thousand Muslims, proceeded to Mecca to make the lesser pitgrimage (the 'umrah). The Quraish left their houses and watched the Muslims from their tents pitched on the heights- of the surrounding hills. After three days' sojourn, the Muslims retired strictly in accordance with the terms of the treaty.

The Battle of Mu'ta

It has already been mentioned that the envoy sent to the Ghassanid prince of Busra had been killed en route at the hands of Shurahbil, a feudatory of the Byzantine emperor. In order to exact reparations, the Prophet, on his return to Medina after the pilgrimage, sent a force of 3,000 men with an order to go to the place where the envoy (Harith ibn 'Umayr al-Azdi) had been killed.

The Holy Prophet gave to Zaid ibn Harithah the command of the army, saying, "If Zaid is killed, then Jatar ibn Abi Talib will be the commander, and if he, too, is killed, then 'Abdullah ibn Rawahah will command the army. And if he is killed, then the Muslims should

select someone as their commander".

Hearing it, a Jew said: "If he is a true Prophet, none of these three will remain alive." Before dispatching this expedition, he instructed them as follows:

- Many servants of God will be busy worshipping Him in their places of worship (churches). Do not touch them.
- Do not lift your hand against any woman (to strike her).
- Do not kill any child or minor boy.
- Do not kill any old person.
- Do not destroy any green tree.

These instructions imparted in an age when hardly any scruples were exercised during bloody engagements indicate the depth of the Prophet's compassion and the efforts he was exerting to effect reforms in all walks of life.

The Muslim force marched under the command of Zaid ibn Harithah to Mu'ta in Syria. In order to meet it, the Syrians had raised a huge army. Although far outnumbered, the Muslim force gave a heroic account of its valor, but the disparity in number was too great. When its commander, Zaid, was slain, the command was taken over by Ja'far ibn Abi Talib, a cousin of the Holy Prophet. He, too, was killed and 'Abdullah ibn Rawahah, took the command. When, as prophesied by the Holy Prophet, he, too, was martyred, the command went to Khalid ibn al-Walid who was able to bring about a successful retreat.

The Holy Prophet was much grieved by the death of Zaid and Ja'far. About Ja'far, whose hands were both severed before he fell down, the Holy Prophet said that Allah had given him two wings of emerald in place of his arms whereby he flies in the Garden with the angels. That is why Ja'far is known as at-Tayyar (the flyer).

The Fall of Mecca

One of the conditions of the Treaty of Hudaibiyah was that the Quraish would not fight against any ally of the Muslims, nor should the Muslims fight against any ally of the Quraish. In simple language, the clause of 10-years' cease-fire

included the allies as well as the principals.

During the month of Ramadhan of 8 A.H., the Banu Khuza'ah, an ally of the Muslims, were attacked by Banu Bakr and their allies, the Quraish. By virtue of their alliance with the Muslims, the Banu Khuza'ah sought the aid and protection of the Prophet. The Prophet sent an emissary to the Quraish to persuade them to accept any of the following terms:

Reparations should be paid for the massacred people of Banu Khuza'ah, or The Quraish should break their alliance with Banu Bakr, or The treaty of Hudaibiyah should be abrogated.

The Quraish accepted the last alternative. The time had come to free the citadel of Islam from idolatry and to end the reign of oppression in Mecca. The Prophet marched with ten thousand men on the 10th of the month of Ramadhan and camped a short distance from Mecca. The Meccans sent a few scouts, including Abu Sufyan, to find out the strength of the Muslim army. Abu Sufyan was seen by 'Abbas, uncle of the Holy Prophet, who took him to the Holy Prophet.

The Prophet, in honor of the recommendation made by his uncle, offered protection to Abu Sufyan. Then the Prophet said, "Isn't it time for you to know the creed: La ilaha illa-Allah?!" Abu Sufyan replied, "Why not?" Then the Prophet further asked him, "And is it not the time for you to confirm that I am the Messenger of Allah?!" Abu Sufyan said, "I have still some doubt about it." At this response, 'Abbas rebuked Abu Sufyan: "Fie upon you, fellow! Confirm his prophethood or you will be killed!" So Abu Sufyan recited both declarations of the creeds of confirmation, and with him Hakim ibn Hizam and Budail ibn Warqa' also accepted the Islamic creed.

Abul-Fida writes the following in his Tarikh:

"Then the Prophet asked 'Abbas to take Abu Sufyan round the valley of Mazeeq and to show him the army of Islam. 'Abbas said, 'O Messenger of Allah! Abu Sufyan is a boaster! Perhaps you should give him some distinctive order so

that he may have a chance to boast about it among the Quraish.' The Prophet said, 'Well, then, whoever seeks refuge in Abu Sufyan's house shall be given protection. And also he who seeks refuge in the Sacred Mosque and in the house of Hakim Bin Hizam or shuts the door of his house shall be given protection.'

'Abbas further says, 'Then I took Abu Sufyan for a review of the Islamic army. At Abu Sufyan's request, I pointed out to the eminent people from every clan who were present in the Islamic regiments. In the meantime, the Prophet passed by his army, which was clad in green uniforms. Abu Sufyan cried out 'O 'Abbas! Verily your nephew has acquired quite a kingdom!' 'Abbas said to him, 'Woe unto thee! This is no kingship! It is prophethood"!

Apart from a slight resistance offered by 'Ikrimah and Safwan, Muhammad (s.a.w.a.) entered Mecca almost unopposed. It happened on a Friday, the 20th of the month of Ramadhan, 8 A.H.

The city which had scoffed and jeered at Muhammad's prophetic mission, ruthlessly persecuted him and his disciples and ultimately driven his disciples away, had created all manner of obstacles in the propagation of the faith and had waged war upon war on the Muslims. This same city now lay at his feet. At this moment of triumph, he could have done anything he wished with the city and the citizens, but he had not come to the world to cause misery or bloodshed but as a benefactor of mankind, to proclaim the message of God and to guide erring humanity to the righteous course: to the worship of the One and Only God.

' Abdullah ibn Mas'ud says:

" Entering Masjidul-Haram, the Holy Prophet started breaking and demolishing the idols. There were three hundred and sixty idols fixed in the walls and on the roof of the Ka'bah with lead or tin. Any idol near which the Prophet went and towards which he pointed his cane, saying:

Right has come and falsehood has vanished; verily falsehood is destined to vanish (Qur'an, 17:81)

The idol fell headlong on the ground without anyone touching it. Lastly, there remained an idol of Banu Khuza'ah on the rooftop of the Ka'bah. It was made of polished brass. The Prophet ordered 'Ali to climb on his shoulders, which 'Ali did, throwing that last idol down which shattered into pieces on impact".

Then he ordered Bilal, the Ethiopian, to go on the rooftop of the Ka'bah to call the adhan. The wordings of the adhan, coupled with the fact that it was called by a freed Negro slave, caused much heartache among the Quraishites. After clearing the Ka'bah, the first House of God built by Ibrahim (a.s.), of all the symbols of idolatry, he assembled the Quraish and delivered the following sermon to them:

" There is no god but Allah. He has no partners. He has fulfilled His promise and helped His slave and defeated all coalitions (allied) against him. All authority, revenge and blood reparations are under my feet. The guardianship of the Ka'bah and the arrangements for the supply of water to pilgrims are exempt. O! You Quraish! The arrogance of the heathen days and all pride of ancestry God has wiped out. All mankind descended from Adam, and Adam was made of clay".

He then recited the following verse of the Qur'an:

O people! Surely We have created you of a male and a female and made you into nations and tribes so that you may identify one another. Surely the most honorable ofyou with Allah is the one among you who is most pious; surely Allah is Knowing, Aware. (Qur'an, 49:13)

Having dwelt upon the equality and brotherhood of mankind and preached the Unity and the Omnipotence of God, he inquired from the Quraish: "Descendants of Quraish! How do you think I should act towards you?" "With kindness and pity, gracious brother and nephew," beseeched they.

The Prophet magnanimously declared:

" I shall speak to you as Yusuf spoke unto his brothers: 'There is no reproach against you today; God will forgive. He is the most Merciful

and the most Compassionate."' (Qur'an,12:92)

Then he said to them:"Go; you are free!" Mecca lay conquered but not a single house was plundered, nor any woman insulted. Cruelties, insults and oppression perpetrated during a long period of twenty-one years were now forgiven. The Muhajirun were asked even to forego their houses and properties, which on their migration to Medina had been occupied by the Meccans. Through all the annals of history, there have seldom been any conquests like this.

The result of this magnanimity and' compassion was that those very die-hards who had relentlessly opposed the Prophet and refused to listen to the Divine message converged around him in their multitudes and accepted Islam. The glad tidings given by God about the peace of Hudaybiyah came true and His injunction had been obeyed,:

When there comes assistance from Allah and victory, and when you see men entering the religion of Allah in companies, then celebrate the praise of your Lord, and implore His forgiveness; surely He is oft-returning (to mercy). (Qur'an, Ch. 110)

Once the Meccans submitted to the faith, disciples were sent out to all neighboring tribes to invite them, with peace and good will, to embrace Islam. Many tribes responded positively to the call. However, there was one tragic incident, which must be mentioned. Khalid ibn al-Walid (who had accepted Islam a few months before the fall of who had already accepted Mecca) was sent to Banu Khuzaimah Islam. When they learned of Khalid's arrival, they came out cautiously armed. Khalid asked them who they were and in reply he was informed: "They are Muslims following the teaching of Muhammed; they pray in the recognized form of prayer, have built a mosque, recite the adhan and the iqamah and gather together on Fridays for prayers." Khalid then asked them why they had come out to meet him armed.

They said that they were on inimical terms with a fellow Arab clan and mistook Khalid's men for

their enemies. But Khalid did not accept their explanation and asked them to yield their arms. They at one yielded. Khalid then ordered his companions to tie their hands behind their shoulders, then he placed them in the custody of his comrades. Early next morning, he ordered that the custodian of each of the prisoner should himself kill that prisoner. Thus, these innocent Muslims were killed then and there.

Another version of this incident says that when Banu Khuzaimah submitted their arms at the order of Khalid, he himself unsheathed his sword and killed one hundred men of that clan. Someone from Banu Khuzaimah informed the Prophet about this tyranny. The Prophet was angered and in dismay thrice repeated, "O Lord! I deplore Khalid's action"!

Abul-Fida adds: "Then the Prophet sent 'Ali with gold to Banu Khuzaimah and ordered that the blood money of the victims and compensation for their lost properties should be paid with the same. 'Ali did as he was bidden".

The Battle of Hunain

The violent tribes of Hawazin and Thaqif joined hands. Collecting a large force, they marched upon the Muslims. In order to enable them to pursue their hostility to the bitter end and to inspire their own ranks to desperate deeds, they had brought their families with them. On the 6th of Shawwal, a pitched battle was fought at Hunain, about ten miles from Mecca. The Hawazin and Thaqif had taken up vantage positions. They almost took the Muslims by surprise, attacking them in the early hours of the morning. They fought in a spirit of desperation. The Muslims first lost ground and their defeat seemed imminent.

At that time, a cousin of the Holy Prophet named Abu Sufyan ibn al-Harith was holding the bridle of the Prophet's horse. As the Prophet was witnessing his people's retreat, he called out to them, "Where are you rmming off to?!" But nobody was paying any attention to him. The Prophet (s.a.w.a.) then told his uncle 'Abbas to call the Muslims back. 'Abbas

wondered as to how his voice would reach the fleeing herd.

The Prophet (s.a.w.a.) said that Allah would cause his voice to reach them, no matter how far they might have gone. 'Abbas called them in these words as the Prophet had taught him: "O group of the Helpers! O people of the tree of Samrah!" Those who proved to be firm in the battle of Hunain include 'Abbas, 'Ali ibn Abi Talib, Abu Sufyan ibn alHarith, 'Aqil ibn Abi Talib, 'Abdullah ibn al-Zubayr, Zubayr ibn al-'Awwam and Usamah ibn Zaid.

AI-Halabi remarks in Al-Sira alHalabiyya that only four persons remained with the Holy Prophet, three of whom were Hashimites, i.e., 'Ali ibn Abi Talib, 'Abbas and Abu Sufyan ibn al-Harith, and one non-Hashimite, i.e., 'Abdullah ibn Mas'ud.

Abul-Fida makes another point. He says:

" When the Muslims fled, the secret malice which the people of Mecca entertained against the Muslims was exposed. Abu Sufyan ibn Harb gleefully cried out, 'They will not stop until they reach the seashore"!

However, after the call of 'Abbas, at last the deserters returned and ultimately the Hawazin and Thaqif were totally routed. The Thaqif took refuge in the city of Ta'if but the families of the Hawazin, with all their flocks and herds, fell into the hands of the Muslims. Ta'if was besieged, but the siege was lifted a day later. The Hawazin approached the Prophet and beseeched him to restore their families to them.

The Prophet answered them that he could not compel his army to forego all the fruits of victory and that if they wanted their families back, they would have to forego their worldly goods. To this, the Hawazin consented. On the next day, on the advice of the Holy Prophet, they approached the Prophet and repeated their request. The Prophet replied, "My own share of the captives, and that of the children of 'Abdul-Muttalib, I give back to you at once." The army followed suit, and six thousand people were set free. The Hawazin

were so overwhelmed by this generosity that many of them accepted Islam there and then.

The spoils of the war, which consisted of 24,000 camels, 40,000 goats, and a considerable quantity of silver, were distributed among the army. In making the distribution, the newly converted Muslims as well as many non-Muslims of Mecca, known in history as "mu'allafatul qulub" (those who were helped in order to win their hearts) were given disproportionately larger shares. Some Ansar considered this as an act of partiality, and their discontent was reported to the Prophet. It was also reported that Ansar feared that now that Mecca was conquered, the Holy Prophet would return to it and migrate from Medina. The Holy Prophet delivered a lecture to them wherein he said:

" O Ansar! I have learned about your discourse. When I came to you, you were wandering in the dark, and the Lord gave you the right direction. You were suffering, and He made you happy. You were enemies of one another, and He filled your hearts with brotherly love and concord. Was it not so, tell me"?

" Indeed, it is even as you say," was the reply: "Lord and to His Prophet belong the benevolence and the grace".

" Nay, by the Lord," continued the Prophet, "but you might have answered (my questions), and answered truly, for I would have testified to its truth myself 'You came to us rejected as an impostor, and we believed in you; you came as a helpless fugitive and we assisted you; you were poor and outcast, and we gave you asylum, comfortless and we solaced you. 'O Ansar! Why do you disturb your hearts because of the things of this life? Are ye not satisfied that others should return with the flocks and the camels, while you go back to your homes with me in your midst? By Him Who holds my life in His hands, I shall never abandon you. If all mankind went one way and the Ansar went another, surely, I would join the Ansar. The Lord be favorable to them, and bless them,

and their children, and their children's children"!

At these words, say the chroniclers, they all wept until tears ran down their beards. And they all cried with one voice, "Yes, Prophet of God, we are well satisfied with our share." (meaning the presence of Holy Prophet in Medina). Thereupon they retired happy and contented. Muhammad soon after returned to Medina .... (Continue)

AKHTAR TABAN

Bimonthly Research Journal

www.allamahrizvi.com

FOR MORE DETAILS:
WWW.ALLAMAHRIZVI.COM